ریاست بہاول پور کے نظمِ مملکت
(۱۸۶۶ء تا ۱۹۴۷ء) کا جائزہ

محمد طاہر *

زیرِ نظر تحقیقی مضمون میں سابق ریاست بہاول پور کے اِکیاسی سالہ(۱۸۶۶ء تا ۱۹۴۷ء) نظامِ حکومت کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس دوران قدیم اور جدید نظام ہائے حکومت کے امتزاج سے ایک نیا حکومتی ڈھانچہ مرتب کیا گیا۔ اگرچہ انگریزوں کا اتحادی ہونے کے ناطے ریاست منقسم اور زیرِ دست اقتدارِ اعلیٰ کی حامل تھی مگر اس کے باوجود نظم و نسقِ مملکت کے وہ تمام شعبے قائم تھے جو موجودہ دور کی آزاد اور خود مختار ریاستوں کا خاصہ ہیں۔ اس مضمون میں اُن تمام حکومتی اداروں کی تشکیل اور کارکردگی کا ناقدانہ جائزہ پیش کیا گیا ہے، جن پر ریاست کا انتظامی ڈھانچہ اُستوار تھا۔ اگر چہ تمام تر اختیارات کا منبع حکمرانِ ریاست کی ذات تھی مگر اس کی انتظامی کونسل حکومتی معاملات میں اسے شورائی معاونت فراہم کرتی تھی۔ اس طرح شاہی محل حکومتی سرگرمیوں کا محور تھا۔ اس زرعی معیشت کی حامل ریاست کو ایک مؤثر مالیاتی نظام سے مستحکم کیا گیا۔ خصوصاً ستلج ویلی پراجیکٹ جیسے عظیم آب پاشی کے منصوبے اور وسیع پیمانے پر کی جانے والی آباد کاری کے ذریعے لاکھوں ایکڑ اراضی کو زیرِ کاشت لانے کا انتظام کیا گیا۔ ریاست کی تعمیر و ترقی کے شعبہ جات میں سے محکمۂ پبلک ورکس، مواصلات، شعبۂ ڈاک و تار اور برقی سپلائی کی پیداوار سے ریاست نے ترقی کے نئے دور کا آغاز کیا۔ اس دوران عوام کو تعلیم اور صحت جیسی بنیادی ضروریات کی مفت فراہمی کے ذریعے فلاحی مملکت کا تصور اُجاگر کیا گیا۔ ریاست نے اپنے عوام کو عدل و انصاف کی فراہمی میں بھرپور کردار ادا کیا۔ امنِ عامہ کے قیام اور جرائم کی

---

* ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ تاریخ، گورنمنٹ ایس۔ای کالج، بہاول پور۔

وک تھام کے لیے پولیس کو ٹریننگ اور اسلحہ سے لیس کیا گیا جب کہ جیل کو اصلاحی ادارے اور پیداواری یونٹ میں تبدیل کرنے کی شاندار روایت قائم کی گئی۔ ریاست نے اپنے بلدیاتی نظام کے ذریعے شہری سہولیات کی فراہمی کو اپنا شعار بنایا۔ریاست میں دفاع اور امورِ خارجہ کے محکمہ جات بھی موجود تھے مگر ان کے تمام اختیارات بالادست انگریزی حکومت کو حاصل تھے۔ خصوصاً ریاست کو ''امپیریل سروس ٹروپس'' کے قیام کی صورت میں برطانوی استعمار کی دفاعی معاونت کا مہنگا ترین فریضہ سرانجام دینا پڑا۔ مگر اس ایک ڈویژن فوج نے برصغیر کی تقسیم کے بعد پاکستانی فوج میں شامل ہو کر استحکامِ پاکستان میں زبردست معاونت فراہم کی۔ غرض یہ کہ مجموعی طور پر ریاست بہاول پور کا نظمِ مملکت اپنے حکومتی اداروں کی ساخت اور کارکردگی کے اعتبار سے ایک مکمل انتظامی ڈھانچے کا حامل تھا۔ جو نا صرف اُس وقت کی بیشتر ہندوستانی ریاستوں کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ تھا بلکہ اپنی فلاحی و رفاہی خصوصیات کی وجہ سے قابلِ تقلید تھا، جس سے آج بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

ریاست بہاول پور کو پاکستان سے الحاق کرنے والی اولین اور سب سے بڑی ریاست کا اعزاز حاصل ہے۔ تقسیم سے قبل اس کا شمار برصغیر پاک و ہند کی چھ سو ترانوے ریاستوں کی فہرست میں دوسرے درجے کی ریاست میں ہوتا تھا۔ جب کہ متحدہ پنجاب اور راجپوتانہ گروپ کی ریاستوں میں ریاست بہاول پور کو دوسری بڑی ریاست کی حیثیت حاصل تھی۔ اسی اہمیت کے پیشِ نظر تاجِ برطانیہ کی منظوری سے امیر آف بہاول پور کے لیے *His Highness* کا لقب اور سترہ توپوں کی سلامی کا اعزاز مختص تھا۔ وہ براہِ راست وائسرائے ہند سے ملاقات کرنے کا مجاز تھا۔ پینتالیس ہزار پانچ سو اٹھاسی مربع کلومیٹر رقبہ اور تیرہ لاکھ اکتالیس ہزار دو سو نو نفوس کی آبادی پر مشتمل اس ریاست کو موجودہ دور کے کئی اہم ممالک پر سبقت حاصل تھی[۲]۔ جہاں تک اس کے اقتدارِ اعلیٰ کا تعلق ہے تو ۱۸۳۸ء کے اینگلو بہاول پور معاہدہ اور اس کے مابعد کی توجیہات کی رُو سے ریاست بہاول پور کو انگریزوں کی بالادست نگرانی میں اپنے اندرونی نظم و نسق کی انجام دہی کا کلی اختیار حاصل تھا، مگر دفاع اور اُمورِ خارجہ کے سلسلے میں یہ ریاست کاملاً برطانوی حکومت کے دستِ نگر تھی[۳]۔

جہاں تک ریاست بہاول پور کے تاریخی ارتقا کا تعلق ہے تو اس کا قیام سندھ میں آباد عباسی النسل داؤد پوتروں کا مرہون منت ہے۔ ۱۷۲۶-۲۷ء کے دوران اس خاندان کی اپنے رشتہ دار سندھ کے حکمران کلہوڑوں سے دیرینہ چپقلش، ان کی اپنے آبائی علاقہ سے بے دخلی پر منتج ہوئی۔ اس موقع

پر صوبۂ ملتان کے مُغل گورنر مرزا شاہنواز خاں المعروف نواب حیات اللہ خاں(متوفی ۱۷۴۸ء) نے داؤد پوترہ سردار امیر صادق محمد خاں اول(۱۷۲۳ء تا ۱۷۴۸ء) کو علاقۂ چودہری(موجودہ تحصیل لیاقت پور) کی جاگیر تفویض کی، تاکہ ضرورت پڑنے پر داؤد پوتروں کی جنگجویانہ صلاحیتوں سے استفادہ حاصل کیا جا سکے۔۱۷۲۷ء میں اس جاگیر کی تفویض ہی دراصل ریاست بہاول پور کی علاقائی و جغرافیائی تاسیس کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی۔[۴]

ریاست بہاول پور میں مجموعی طور پر بارہ نواب حکمران رہے مگر نظم ونسق کے اعتبار سے آخری تین نوابوں کا عہدِ حکومت (۱۸۶۶ء تا ۱۹۴۷ء) خصوصیت کا حامل ہے۔ اس عرصہ کے دوران برطانوی نگرانی میں تین کم سنی کی عبوری حکومتیں قائم رہیں۔ اس عہد کا آغاز نواب محمد بہاول خان رابع (۱۸۵۸ء تا ۱۸۶۶ء) کی وفات سے ہوا۔ اس کا جانشین کم سن نواب صادق محمد خاں رابع(۱۸۶۶ء تا۱۸۹۹ء) تھا ، جس کے مقابلے میں اس کے ایک رشتہ دار جعفر خاں (متوفی ۱۸۶۸ء) نے متوازی حکومت قائم کر لی۔ اس مسلح بغاوت کے استیصال میں ناکامی پر نواب کی والدہ نے انگریزی حکومت سے مدد کی درخواست کی۔ اس کے جواب میں۱۴/اگست۱۸۶۶ء کو ریاستی حکومت کا نظمِ مملکت نواب صادق محمد خاں رابع کی بلوغت تک پولیٹیکل ایجنٹ کے سپرد کر دیا گیا، جسے منتظم و نگرانِ اعلیٰ کی حیثیت سے سپرنٹنڈنٹ ریاست بھی کہا جاتا تھا۔ اس کی معاونت کے لیے ایک انگریز اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ و اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ اور ایک اضافی مقامی ایجنٹ و اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کا تقرر کیا گیا۵۔ اس عبوری حکومت کو ''ایجنسی کی حکومت'' یا ''دورِ مداخلت'' کا نام دیا جاتا ہے۔ یہی وہ عہدِ نو ہے جسے انتظامی اعتبار سے جدید نظامِ حکومت کا نقطۂ آغاز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کی ساخت برطانوی ہند میں رائج انتظامی اداروں کی طرز پر استوار کی گئی۔ یہی وہ نظام تھا جو اپنی تمام تر ارتقائی خصوصیات کے ساتھ۱۸۷۹ء میں نواب صادق محمد خاں رابع کو بالغ ہونے پر سپرد ہوا۶۔ نواب مذکورہ نے ریاست کے نظم ونسق کو مقامی روایات سے ہم آہنگ کیا اور اسے عوامی اعتبار سے زیادہ قابلِ عمل بنایا۔ ایک عہد ساز شخصیت ہونے کے ناطے نواب مذکورہ کو ''صُبحِ صادق'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، یعنی ریاست کو تعمیر و ترقی کی نئی سحر سے ہمکنار کرنے والا نواب۔۱۴فروری۱۸۹۹ء کو نواب کی وفات اور اُس کے جانشین نواب محمد بہاول خاں خامس(۱۹۰۳ء تا ۱۹۰۷ء) کی کم سنی دوبارہ ایجنسی کی

حکومت کے قیام پر منتج ہوئی۔ اس کی سات رُکنی انتظامی کونسل چار سال (۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۳ء) تک ریاست کے نظامِ حکومت میں دخیلِ کار رہی۷۔ اس دوران انتظامی شعبوں نے قدرے ترقی کا سفر طے کیا۔ اس کے بعد نواب محمد بہاول خاں خامس تخت نشین ہوا۸۔ اُس کا مختصر عہد تعمیراتی اعتبار سے شاہجہانی عہد اور عدل و انصاف کی ترویج کی وجہ سے جہانگیری عہد سے مماثلت رکھتا ہے۔ وہ بہاول پور کو حقیقی معنوں میں ایک جدید ترقی یافتہ ریاست میں تبدیل کرنا چاہتا تھا، مگر اس کی جواں مرگی اس کے منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی راہ میں حائل ہوئی۔ اس طرح ایک بار پھر اُس کے جانشین کی کم عمری عبوری حکومت کے قیام کا سبب بنی۔ مگر اس بار ریاست کا انتظام کونسل آف ریجنسی (۱۹۰۷ء تا ۱۹۲۴ء) کو سونپا گیا، جس کا صدر اور پانچ ممبران ایسے نامزد مقامی افراد تھے، جنہیں ریاستی نظم و نسق کا وسیع تجربہ حاصل تھا۹، برطانوی حکومت کی طرف سے سول معاملات میں پولیٹیکل ایجنٹ اور فوجی معاملات میں ایک ملٹری ایڈوائزر نگرانِ اعلیٰ کی حیثیت سے ریجنسی کے معاملات کو کنٹرول کرتے تھے۔ سترہ سال کی طویل المعیاد عبوری حکومت ترجیحی طور پر برطانوی مفادات کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور تھی۔ تاہم مقدور بھر عوامی خواہشات اور مقامی رجحانات کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ ۸ مارچ ۱۹۲۴ء کو نواب صادق محمد خاں خامس (۱۹۲۴ء تا ۱۹۵۵ء) کو اختیارات تفویض کیے گئے۱۰۔ ان کا طویل ترین دورِ حکومت متنوع خصوصیات کا حامل ہے۔ اُنہوں نے اپنی انتظامی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے حکومتی شعبوں کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا، انتظامی عہدوں پر انتہائی باصلاحیت افراد کو تعینات کیا۔ وہ نظم و نسق کے معاملے میں انتہائی سخت گیر مؤقف کے مالک تھے۔ حکومتی معاملات میں بے جا مداخلت، اَقربا پروری اور سفارش کے سدِباب کے لیے وہ اپنی اولاد تک کو ایک فاصلے پر رکھتے تھے۔ وہ نظم و نسق کے معاملات پر کڑی نظر رکھتے تھے اور اس سلسلے میں کسی بھی خامی یا بے قاعدگی کا سختی سے محاسبہ کرتے تھے۔ وہ عوام کی فوری داد رسی کو اپنا اولین فریضہ تصور کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں حکومتی اداروں کا نظام خاصا فعال رہا، ریاستی وسائل میں ترقی ہوئی اور ریاست خوش حالی کی راہ پر گامزن رہی۔ اگرچہ نواب صادق محمد خاں خامس نے اپنی حکمرانی کا آغاز مطلق العنانیت سے کیا مگر انجام کار اپنے عوام کو جمہوری حقوق تفویض کیے۔

۳ جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم کا منصوبہ پیش ہونے کے فوراً بعد کانگریسی قیادت کی طرف سے بہاول

پور کے وزیراعظم مشتاق احمد گورمانی کی ملی بھگت سے نواب صاحب کو اپنی ریاست کا الحاق ہندوستان سے کرنے کی ہر ممکنہ ترغیب و تحریص کی گئی[۱۱]۔ مگر نواب صادق محمد خاں خامس نے اس کے برعکس ۱۳اکتوبر ۱۹۴۷ء کو اپنی ریاست کا الحاق مملکتِ پاکستان سے کیا[۱۲]۔ اس طرح اپنے دو سو بیس سالہ موروثی اقتدار سے دست بردار ہو کر موجودہ پاکستان کے چاروں صوبوں کے درمیان جغرافیائی سالمیت اور مواصلاتی ربط پیدا کرنے میں معاونت فراہم کی۔ پاکستان سے الحاق کے بعد ریاست بہاول پور کا علیحدہ انتظامی یونٹ اپنی داخلی خود مختاری کے ساتھ قائم رہا، جس کا مکمل ادغام ۱۴/اکتوبر ۱۹۵۵ء کو وحدتِ مغربی پاکستان کے نتیجے میں عمل میں آیا[۱۳]۔

نظم و نسق کے حوالے سے ریاست بہاول پور کے مجموعی طور پر دو سو اٹھائیس سالہ (۱۷۲۷ء تا۱۹۵۵ء) انتظامی دور میں سے اس کے اکیاسی سالہ (۱۸۶۶ء تا ۱۹۴۷ء)عہد کا درمیانی عرصۂ حکومت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس دوران یکے بعد دیگرے تین عبوری حکومتیں اور تین نواب برسرِ اقتدار رہے۔ یہی وہ عرصہ ہے جس کا آغاز ریاست کی نشأۃِ ثانیہ کا سبب بنا۔ قدیم اور جدید حکومتی اداروں کے امتزاج سے ایک نیا انتظامی ڈھانچہ مرتب ہوا، جسے قابلِ عمل بنانے کے لیے اسے مقامی تقاضوں اور روایات سے ہم آہنگ کیا گیا۔ ریاست بہاول پور انتظامی طور پر متعدد بڑی اور چھوٹی انتظامی اکائیوں میں تقسیم ہوئی[۱۴]۔ان کے انتظام و انصرام کے لیے عہدہ داران مقرر ہوئے ، جنہیں لوگوں کے مسائل مقامی طور پر حل کرنے کے اختیارات حاصل تھے، جہاں تک نظم و نسقِ مملکت کا تعلق ہے تو اس کے تمام تر اختیارات حکمرانِ ریاست کی ذات میں مرتکز تھے البتہ اس کے توسط سے حکومتی شعبہ جات کا انتظام و انصرام انتظامی کونسل کے سپرد تھا[۱۵]۔جو اپنے اقدامات اور فیصلوں کے عملی نفاذ کے لیے نواب کی قطعی توثیق کی مرہون منت تھی۔ جب کہ عبوری حکومتوں کے دور میں اہم معاملات کی توثیق کا اختیار پولیٹیکل ایجنٹ کو حاصل تھا[۱۶]۔ امیرانِ بہاول پور کی جانشینی کی منظوری اور بالغ ہونے پر انہیں اختیارات کی تفویض وائسرائے ہند کی طرف سے عمل میں آتی تھی۔۱۸۶۶ء کے بعد اُصولِ جانشینی کی مسلمہ روایات کے مطابق ہر حکمران کے بعد اس کے سب سے بڑے بیٹے کو ہی وارثِ تخت قرار دیا گیا[۱۷]۔ ریاستی انتظامیہ میں امیرانِ بہاول پور کو کلیدی حیثیت حاصل تھی۔ تاہم وہ نظریاتی اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے اقتدارِ اعلیٰ کے قائل تھے۔ وہ اپنی تمام تر بشری کمزوریوں اور شخصی حکومت کی خامیوں کے

باوجود معاشرتی و اخلاقی قیود کے پابند تھے ۔ اگرچہ وہ ظاہری جاہ و جلال کو نظم ونسق کے قیام کے لیے ضروری سمجھتے تھے مگر ان کا یہ انداز انہیں عوام سے دور رکھنے میں مانع نہ تھا۔ مجموعی طور پر ان کا طرز عمل بلا تخصیص مذہب انصاف پروری، رحمدلی ، مہربانی اور فیض رسانی کا مظہر تھا۔ ان کا ریاست کے فلاحی و رفاہی تصور کو اجاگر کرنے کے لیے حواصل کے جوڑے کو سرکاری نشان قرار دینا دراصل اس بات کا عزم تھا کہ وہ ان پرندوں کی سرشت کے مطابق اپنی رعایا کے لیے انتہائی مشفق ماں باپ ثابت ہوں گے اور ضرورت پڑنے پر انہیں اپنا خون اور گوشت تک کھلانے سے بھی دریغ نہ کریں گے[۱۸]۔ اپنی ریاست کے اندرونی معاملات میں خود مختار ہونے کے ساتھ ساتھ امیرانِ بہاول پور دینِ اسلام کے پیروکار اور حامی تصور ہوتے تھے۔ امیرانِ بہاول پور نے انگریزوں کی بالا دستی کے باوجود اپنی ریاست کا اسلامی تشخص برقرار رکھنے کی ہر ممکنہ سعی کی۔ انہوں نے اپنی مملکت میں اسلامی قوانین نافذ کیے۔ اپنے پرچم کو کلمۂ طیبہ کی شمولیت سے بابرکت بنایا ، جمعہ کی تعطیل کو لازم کیا، سرکاری لباس کے طور پر ترکی ٹوپی، سیاہ اچکن اور سفید شلوار قمیض کو رائج کیا[۱۹]۔ یہی وہ اقدامات تھے جن کی بدولت ریاست بہاول پور کو برصغیر پاک و ہند کی ایک اہم اسلامی ریاست کی حیثیت سے شہرت حاصل ہوئی۔

فی الحقیقت امیرانِ بہاول پور کے دورِ حکومت میں شاہی محل اور اس کے ادارے حکومتی سرگرمیوں کا مرکز تھے۔ شاہی محل کا نظام ترکانِ عثمانیہ ، سلاطینِ دہلی، مغل اور انگریزی لوازمات و روایات سے مخلوط تھا، مگر اس کے اداروں کو فعال بنانے کے لیے انہیں مقامی رسوم و رواج سے ہم آہنگ کیا گیا تھا۔ اگرچہ ظاہراً شاہی محل اور اس کے بیشتر اداروں کا مقصد امیرانِ بہاول پور کو سہولیات اور آسائشات کی فراہمی معلوم ہوتا ہے، مگر حقیقتاً انہیں ریاست کے مرکزی سیکرٹریٹ کا درجہ حاصل تھا۔ دراصل یہی وہ مقام تھا جہاں نہ صرف سیاسی و حکومتی حکمت عملیاں وضع ہوتی تھیں۔ بلکہ ہر قسم کی معاشی و ثقافتی سرگرمیاں بھی پروان چڑھتی تھیں۔ امیرانِ بہاول پور اور ان کے محلات ہر قسم کے دنیاوی اعزاز و مراعات ، عزت و وقار اور معاشی کفالت اور روزگار کا ذریعہ تصور ہوتے تھے۔ محکمۂ تصریفات نہ صرف حکمرانِ ریاست کے اخراجات اور اشیائے صرف کی بہم رسانی کا ذمہ دار تھا بلکہ وہ غربا، مساکین ، معذوروں اور یتیموں کی کفالت کا فریضہ بھی سرانجام دیتا تھا[۲۰]۔ اندرونِ ریاست اور ہندوستان بھر کے

اہم تعلیمی اداروں اور معاشرتی بہبود کی انجمنوں کو یکمشت اور سالانہ امداد یہیں سے فراہم کی جاتی تھی۔ ۱۹۰۸ء میں نواب صادق محمد خاں خامس کی دادی حضرت مائی صاحبہ نے ندوۃ العلماء لکھنو کو پچاس ہزار روپے چندہ دیا تو اس پر شبلی نعمانی نے شکریہ کے خط کے ساتھ انہیں ''زندہ زبیدہ خاتون'' کے خطاب سے معنون کیا۔ اس طرح ۱۹۱۱ء میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کی تعمیر کے لیے ڈیڑھ لاکھ روپے امداد فراہم کی گئی، جب کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو ۱۹۳۰ء تک دو لاکھ اناسی ہزار دو سو روپے کی ادائیگی کی گئی ۔ اس طرح پنجاب یونیورسٹی کے سینٹ ہال کی تعمیر بھی کرائی گئی۔ اس کے علاوہ انجمن حمایت اسلام اور اس کے اداروں کو بھی گراں قدر امداد دی جاتی تھی[۲۱]۔ یہی وہ ادارے تھے. جنہوں نے تحریک پاکستان میں بھر پور کردار ادا کیا۔

امیران بہاول پور کی قیادت میں منعقد ہونے والے شاہانہ دربار، پروقار تقاریب، جشن اور جلوس جہاں ایک طرف اُن کے جلال وعظمت کی علامت تھے، وہاں دوسری طرف یہ عوام سے رابطے کا ایک بڑا ذریعہ تھے۔ ایسے مواقع مظلوم عوام کی داد رسی ، ضرورت مندوں کی امداد اور غریب پروری کا باعث ہوتے تھے۔ شاہی محل کے تمام ادارے بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ اصطبل ، فیل خانہ، شتر خانہ، رتھ خانہ، بگھی خانہ کی بدولت ریاست میں باربرداری کے جانوروں کی افزائش، نسل کشی اور علاج معالجے میں معاونت ملتی تھی۔ جب کہ بیسویں صدی کے آغاز سے ہی موٹر خانہ کے قیام نے ریاست کو جدید مواصلاتی ذرائع فراہم کیے۔ نواب صادق محمد خاں خامس نے چودہ اگست ۱۹۴۷ء کو قیام پاکستان کی تقریب کو شایانِ شان طریقے سے منانے کے لیے اپنی نصف درجن کاریں کراچی روانہ کیں۔ اس موقع پر خود قائد اعظم اور مونٹ بیٹن ریاست بہاول پور کی رولز رائس میں سوار ہوئے[۲۲]۔ اس طرح شاہی باورچی خانہ اور توشہ خانہ محل میں رہائش پذیر افراد کے علاوہ شاہی مہمانوں کے لیے طعام و قیام کی تمام ضروریات پوری کرتے تھے۔ بعض اوقات مہمانوں کی فہرست میں وائسرائے اور مہاراجوں سے لے کر ایک معمولی آدمی تک شامل ہوتے تھے۔ باورچی خانہ میں انواع و اقسام کے کھانے تیار کیے جاتے تھے[۲۳]۔ یہاں پر کام کرنے والے باورچی ان کھانوں کو ریاست بھر میں متعارف کراتے اور مقامی کھانوں کو بیرون ریاست متعارف کرایا جاتا۔ جب کہ توشہ خانہ کا شعبہ سوئی سے لے کر قیمتی خیموں ، فرنیچر اور سونے کے برتنوں تک کی ایک خاصی تعداد رکھتا ، جنہیں اہم تقریبات کے مواقع پر

استعمال میں لایا جاتا تھا[۲۴]۔ ہوٹلوں اور ریسٹورنٹ کی صنعت کی غیر موجودگی میں ان اداروں کی بہت افادیت تھی۔ اس طرح محل سے متصل کارخانہ جات کئی صنعتوں اور دستکاریوں کے فروغ کا باعث تھے۔اگر اس دور میں اسی نہج پر ریاست بھر میں صنعتی و فنی مراکز قائم کر دیے جاتے تو آج یہ خطہ بہت ترقی یافتہ ہوتا۔ ان محلات کا سب سے پوشیدہ مگر بارونق حصہ حرم سرا تھا[۲۵]۔ امیران بہاول پور نے شرعی اور جبلی تقاضوں سے انحراف کرتے ہوئے اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو رشتۂ ازدواج سے منسلک کرنا اپنی توہین سمجھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے بے شمار شرعی اور غیر شرعی نکاح کیے۔ نتیجتاً حرم سرا سینکڑوں خواتین کا مسکن تھا ۔ جہاں مقامی تہذیب و معاشرت ، اندازِ آرائش و زیبائش ، رقص و سرور کی محفلیں سجتیں۔ مگر زنان خانے میں ماسوائے نواب کے کسی اور مرد کا سایہ بھی داخل نہ ہوسکتا تھا۔ اس طرح یہ ایک ایسا حسین قفس تھا، جہاں ایک بار جنم لینے والی یا داخل ہونے والی عورت یہاں سے پھر کبھی نہ نکل سکتی تھی۔ کثرتِ ازدواج سے نہ صرف حکمران خاندان کی نسبی روایات تبدیل ہوئیں بلکہ اس کے انتشار و افتراق کا سبب بنیں۔ محل کا ایک حصہ '' کتب خانۂ سلطانی'' اور '' میوزیم سلطانی'' پر مشتمل تھا، جو بلا شبہ برصغیر پاک و ہند کے نادر علمی، تاریخی اور تہذیبی ورثے کا حامل تھا[۲۶]۔ شاہی لائبریری کی سوا دو سو سالہ تاریخ میں ہر نواب نے اس میں گراں قدر مخطوطات اور کتب کا اضافہ کیا۔ جب کہ میوزیم میں قیمتی نوادرات کا ذخیرہ کیا جاتا رہا۔ نواب صادق محمد خاں خامس کی وفات کے بعد یہ دونوں ادارے حکمران خاندان کی باہمی چپقلش کی وجہ سے لوٹ کھسوٹ کا شکار ہو گئے۔

جہاں تک ریاست بہاول پور کے مالیاتی ڈھانچہ کا تعلق ہے تو اسے برصغیر میں مروج قدیم نظامِ مال گزاری، خصوصاً ہمسایہ علاقہ جات سندھ اور ملتان کے آزمودہ مالیاتی تجربوں پر اُستوار کیا گیا تھا۔ پہلی ایجنسی کے دور میں مالی ابتری کا خاتمہ کیا گیا۔ غیر ضروری اخراجات پر قدغن لگائی گئی، آمدن و خرچ کی مدیں مقرر کی گئیں اور ان کے اندراج اور جانچ پڑتال (Auditing) کا طریقۂ کار اختیار کیا گیا ۔ ۱۸۶۶ء کے بعد ریاستی خزانے کا بیشتر حصہ حکمران کی ذات پر خرچ کرنے کی بجائے ترقیاتی کاموں پر خرچ کرنے کی حکمت عملی اختیار کی گئی۔ اصلاحات کے نفاذ سے زرعی اجناس کی پیداوار میں اضافے کی ہر ممکنہ کوشش کی گئی۔ اس کے نتیجے میں ہمسایہ برطانوی اضلاع کے مقابلے میں مال گزاری کے تخمینے (Assessment) کی اوسط شرح میں اضافہ ہوا ۔اور ریاست کی اقتصادی حالت بہتر

ہوئی۔۱۸۶۷ء میں باقاعدہ خطوط پر محکمۂ مال کا قیام عمل میں آیا، جس کے سپرد ترقی زراعت کا کام بھی تھا ۔ جب کہ خزانے کا شعبہ علیحدہ سے قائم کیا گیا ۔ ہر مالیاتی اکائی (نظامت) کے ناظم کو اپنے علاقے میں انتظامی و عدالتی اختیارات تفویض ہوئے۲۷۔ ۱۹۰۳ء کے دوران محکمۂ مال کی تنظیمِ نو ہوئی تو ضلع، تحصیل اور سب تحصیل کے نام سے مالیاتی اکائیاں قائم ہوئیں۲۸۔۱۹۲۴ء میں وزارتِ مال کا قیام عمل میں آیا۔ آمدنی اور پیداوار کے تمام اہم شعبہ جات اس کے سپرد کر دیے گئے۔ مگر اس کے ساتھ ہی فنانس منسٹر کے تقرر کا اختیار حکومتِ ہند نے خود حاصل کر لیا۔ دراصل یہی وہ طریقہ تھا جس کے ذریعے برطانوی سامراج مقامی ریاستوں کی اقتصادیات میں زیادہ سے زیادہ اثر و نفوذ اور تصرف حاصل کرتا تھا۔ محکمۂ مال کا ایک بڑا کارنامہ بندوبستِ اراضی کا انتظام تھا اس کے ذریعے تمام قابلِ کاشت رقبہ معلوم کیا گیا ۔ ہر دس سال کے لیے تشخیص اراضی ہوئی ۔ زمین کی درجہ بندی اور اس پر کاشت کردہ اجناس کی اوسط قیمت کے مطابق مالیہ کی فی بیگھہ شرح مقرر کی گئی۔ پانچ بیگھہ اراضی تک کے کاشتکاران کو مالیہ کی ادائیگی سے مُستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ مال گزاری کی تحصیل کے لیے جنس کی بجائے نقدی کا طریقہ اختیار کیا گیا۲۹۔ یہی وہ اصول تھے جنہیں آئندہ کے لیے زرعی محصولات کی بنیاد بنایا گیا ۔ مالیۂ اراضی اور آبیانہ سے حاصل شدہ آمدنی کے علاوہ بیس کی تعداد میں اور محصولات بھی عائد کیے جاتے تھے۔ ان میں سے کچھ ٹیکس فی الواقع عوام پر بوجھ کے مترادف تھے۔ ان میں خصوصیت سے جانوروں کی چرائی کا ٹیکس اور کھجور کے درختوں پر ٹیکس شامل تھے۔ ۱۸۶۶ء کے بعد اخراجات سے متعلق ایک نیا تصور پیدا ہوا ۔ اس سے پیشتر ریاستی خزانہ حکمران کی نجی ملکیت تصور ہوتا تھا۔ اگر عوام پر کچھ خرچ بھی کیا جاتا تھا تو وہ ان کا حق سمجھ کر نہیں بلکہ خیرات ، امداد اور ثواب کی غرض سے کچھ رقم مختص کر دی جاتی تھی۔ مگر باقاعدہ بجٹ کا نظام رائج ہونے سے امیرانِ بہاول پور کے نجی اخراجات کے لیے ایک خاص رقم مختص کر دی گئی۔ جب کہ اس کا معتدبہ حصہ انتظامی اداروں اور تعمیرات کے علاوہ تعلیم اور صحتِ عامہ کے شعبوں پر خرچ کیا جانے لگا۔ مگر ریاستی حکومت کو انگریزوں کے اتحادی ہونے کا معاوضہ امدادی فوج کے اخراجات کی صورت میں برداشت کرنا پڑتا تھا جو اس کے بجٹ کے پچیس فی صد سے متجاوز تھے۔ یہ ایسے اخراجات تھے جن کا ریاست یا اس کے عوام سے کوئی مفاد وابستہ نہ تھا۔ البتہ ریاست کے مجموعی بجٹ کی رقم میں سالانہ اضافہ اور ترقیاتی منصوبوں پر

اخراجات کا رُجحان اس کی صحت مند معیشت کی دلیل تھی۔ مثلاً ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۳ء کے دوران ستلج ویلی پراجیکٹ پر اُٹھنے والے مجموعی اخراجات میں سے دو کروڑ روپے ریاست نے اپنی بچتوں میں سے خرچ کیے۔ جب کہ بارہ کروڑ روپے حکومت ہند سے قرض لیے گئے[۳۰]۔ اس کی واپسی منصوبے کی تکمیل کے ترپن برس بعد ہونا تھی۔ مگر ریاست نے قرض کی رقم جو سود کے ہمراہ ستائیس کروڑ روپے تک متجاوز ہو چکی تھی، کو تاریخ ادائیگی سے چھتیس سال پیشتر ادا کر کے اپنی مضبوط معیشت کا ثبوت دیا۔ ریاست بہاول پور کا محکمۂ حساب و خزانہ جات تمام آمدنی و خرچ کا ریکارڈ رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ جمع شدہ نقدی، سونا، چاندی اور دیگر قیمتی اشیا کی حفاظت کرتا تھا۔

چونکہ ریاست بہاول پور زرعی معیشت کی حامل تھی اس لیے زراعت اور اس سے وابستہ افراد کی ترقی اور بہبود کے لیے ہر ممکنہ کوشش کی گئی۔ مثلاً ریاست کے لاکھوں ایکٹر غیر آباد رقبے کو زیرِ کاشت لانے کے لیے بیرونِ ریاست سے زراعت پیشہ اقوام کو انتہائی آسان شرائط پر اراضی تفویض کی گئی۔ مگر اس سلسلے میں نہ تو کسی قسم کے تحفظات کو ملحوظ رکھا گیا اور نہ ہی مستقبل کے لیے کوئی پیش بندی کی گئی۔ ریاست کی زرخیز زمینوں سے معاشی مفاد حاصل کرنے والوں میں ایسے طبقات پیش پیش تھے جن کا زراعت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مثلاً حکومت ہند کے دباؤ پر برطانوی فوج کے ہندوستانی سپاہیوں کو فوجی گرانٹس کی صورت میں ہزارہا ایکٹر اراضی سے نوازا گیا[۳۱]۔ یہ قبیح رسم قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک جاری ہے، جس کی رو سے حاضر سروس اور ریٹائرڈ فوجیوں کو کئی چک الاٹ کیے جا چکے ہیں۔ اس لوٹ کھسوٹ میں بیوروکریسی اور معمولی اہلکاران نے بھی خوب ہاتھ رنگے۔ ہر دور کا برسرِ اقتدار سیاسی ٹولہ بھی اس بندربانٹ میں شامل رہا۔ ان بارسوخ طبقات نے اپنے اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی الاٹ شدہ زمینوں کا تبادلہ زیادہ بہتر مقامات پر کرایا، انہیں آباد کرنے کے لیے سرکاری مشینری اور وسائل کا بلا دریغ استعمال کیا۔ نہری پانی اور سڑکوں کو زیادہ سے زیادہ اپنے تصرف میں لانے کی کوشش کی۔ غیرزراعت پیشہ افراد کو رقبہ جات کی بطور انعام تفویض سے کاشتکار طبقہ اور خصوصاً مقامی باشندوں کا سخت استحصال ہوا۔ اسی مراعات یافتہ طبقہ نے خود کاشت کی بجائے چھوٹے آباد کاروں اور مقامی مزارعین کی محنت کو بروئے کار لا کر اپنی مملوکہ اراضی کو آباد کیا۔ جب کہ ان میں سے بیشتر نے موقع محل کی مناسبت سے اپنے رقبہ جات کو اونے پونے داموں

فروخت کر کے بڑے شہروں کے ڈیفنس ایریاز میں رہائش پذیر ہوئے اور یہاں سے کمائے جانے والی رقم سے دوسری جگہ سرمایہ کاری کرنے کو ترجیح دی۔

آباد کاری سے متعلق ناقص منصوبہ بندی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اراضی کے حصول کے لیے کوئی حد مقرر نہ کی گئی۔ ۱۹۰۸ء کے ''قانون تعہد اراضیات'' کے تحت کوئی بھی آباد کار صرف ڈیڑھ روپیہ فی بیگھہ کے حساب سے ایک ہزار بیگھہ تک اراضی حاصل کر سکتا تھا۔ جب کہ رقم کی ادائیگی، زمین کی قسم کے مطابق بارہ سال سے بیس سال کے عرصے میں بذریعہ اقساط ادا کرنا ہوتی تھی[۳۲]۔ حالانکہ زرعی نظام کی کامیابی کے لیے ضروری تھا کہ جاگیرداری کے رجحان کو روکا جاتا۔ آبادکاری کے لیے فی خاندان اراضی کی اتنی حد مقرر کی جاتی جسے باآسانی کاشت کیا جاسکتا۔ ایک ہی فرد یا خاندان کو نوازنے کی بجائے مزید خاندانوں کی معاشی کفالت کا اہتمام کیا جاتا۔ مگر کوئی ضابطہ نہ ہونے کی وجہ سے چند بڑے زمینداروں کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آیا جس نے مقامی اور قومی سیاست میں وارد ہو کر ہر دور کی آمرانہ اور غیر جمہوری طاقتوں کی پشت پناہی کو اپنا شعار بنایا۔ اس قسم کے آباد کارانہ نظام کے نتیجے میں مقامی آبادی کے حقوق بری طرح سے متاثر ہوئے۔ ریاستی حکومت سے یہ بڑی کوتاہی ہوئی کہ مقامی کاشتکار طبقہ کے لیے مستقل بنیادوں پر آباد کاری کے علاقوں میں کسی قسم کا کوئی کوٹہ مختص نہ کیا گیا۔ نتیجتاً ریاست میں زرعی معیشت کی ترقی کے نتیجے میں حاصل ہونے والے ثمرات سے زیادہ تر آباد کار طبقہ ہی مستفید ہوا اور مقامی افراد اپنی سہل پسندی اور حکومت کی بے اعتنائی و بے توجہی کی وجہ سے اس معاشی دوڑ میں کوئی پیش رفت نہ کر سکے۔ یہی وہ عوامل تھے جو بعد ازاں مقامی اور غیر مقامی آبادی میں معاشی و معاشرتی عدم توازن کا سبب بنے۔ خصوصاً دیہی معاشرے میں یہ فرق آج بھی نمایاں ہے۔ ریاست میں آباد کاری کے نتیجے میں اگرچہ معاشی ترقی کو مہمیز ملی مگر اس کے ساتھ ہی یہاں کی قدیم معاشرتی و اخلاقی اقدار بھی متاثر ہوئیں۔ خاص طور پر رشوت، بدعنوانی اور اقربا پروری جیسی قباحتوں نے دراندازی کی، مگر اس کے ساتھ ساتھ آباد کاری نے یہاں کے جامد معاشرے میں کئی تبدیلیاں پیدا کیں۔ مقامی آبادی میں جذبۂ مسابقت پیدا ہوا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پردے کی ناروا بندشوں سے یہاں کی مقامی خواتین کو ایک حد تک آزادی ملی، جس سے ان میں تعلیم اور ترقی کے حصول کی ترغیب ہوئی۔ مگر آباد کاری کی اس غیر متوازن پالیسی سے قطع نظر امیران بہاول پور نے کاشت کار طبقہ کی بہبود کے لیے کئی مثبت اقدامات کیے۔ یہاں کا

زمین دار طبقہ صدیوں سے ہندو ساہوکار کے استحصال کا شکار ہوتا رہا تھا۔ وہ اپنے کھاتوں میں قرض کی رقم کو بڑھا چڑھا کر لکھ لیتے ، اس پر سود در سود کا اضافہ کرتے جاتے۔ اس طرح ایک بار قرض لینے والا پھر کبھی ان کے چُنگل سے نکل نہ پاتا اور جلد یا بدیر نتیجہ مدعیون کی گرفتاری اور جائدادِ مرہونہ کی قُرقی پر منتج ہوتا ۔ چنانچہ اس کے تدارک کے لیے، اُنیسویں صدی کے اختتام پر ''سود درسود'' کے نظام کے خلاف قانون سازی کی گئی[۳۳]۔ قانون معیادِ سماعت کے تحت قدیم سودی مقدمات پر پابندی لگا دی گئی۔ مقروض کی گرفتاری یا اس کی فصل اور آلاتِ کشاورزی کی ضبطی کی ممانعت کر دی گئی۔ سود کی شرح مقرر کر دی گئی۔ حکومت نے دیہی عوام کو کم شرحِ سود پر قرض کی فراہمی کے لیے کوآپریٹو سوسائٹیوں کے قیام میں معاونت فراہم کی۔ علاوہ ازیں زراعت پیشہ افراد کو اہلکارانِ ریاست کی چیرہ دستیوں سے تحفظ کے لیے ضوابط بنائے۔ نواب اور عمالِ ریاست کے دوروں کے دوران رسد کی فراہمی اور مفت اشیاء کی وصولی کی ممانعت کر دی گئی۔۱۹۱۰ء میں نہروں اور بھل صفائی کے لیے لی جانے والی جبری مشقت (چھیڑ بندی) کا خاتمہ کر دیا گیا[۳۴]۔ آفاتِ اَرضی وسماوی کی صورت میں مالیہ اور آبیانہ میں معافی اور چھوٹ کی رعایت دی جاتی تھی۔ مگر زرعی پیداوار کی ترقی اور کسانوں کی رہنمائی کے لیے عملی اقدامات کا آغاز ۱۹۳۷ء میں ''محکمۂ اصلاحِ دیہات'' اور ۱۹۴۱ء میں ''محکمۂ زراعت'' کے قیام سے ہوا[۳۵]۔ اس کے تحت زرعی شعبہ میں جدید تحقیق اور طریقوں سے متعلق آگاہی پیدا کی گئی۔ بیجوں کی اعلیٰ اقسام اور جدید آلاتِ زرعی کی فراہمی کا آغاز کیا گیا۔ قدرتی کھاد کی تیاری اور استعمال کے طریقے سے آگاہ کیا گیا ،فصلوں کی بیماریوں کے تدارک ، کیڑوں ، سنڈیوں اور ٹڈی دَل کے اتلاف کے لیے اقدامات کیے گئے۔ ریاست بھر میں باغات لگانے کے لیے فروٹ نرسری قائم کی گئی۔ زراعت کی عملی تربیت کے لیے ٹریننگ سکول قائم کیا گیا۔ زرعی اجناس سے متعلق مارکیٹ ایکٹ، مارکیٹ کمیٹیوں اور منڈیوں کا قیام عمل میں آیا۔ غرض کہ قیام پاکستان کے وقت زرعی معیشت انتہائی سرعت سے ترقی کی طرف گامزن تھی[۳۶]۔

مگر ریاست کے قدیم جاگیردارانہ نظام میں اصلاح کی کوئی کوشش نہ کی گئی۔ اس طرح زمیندار اور مزارعین کے درمیان بہتر تعلقات اُستوار کرنے کے لیے کوئی شعوری کوشش نہ کی گئی۔ مزارعین کے حقوق سے متعلق کسی قسم کی قانون سازی کی ضرورت کو محسوس نہ کیا گیا۔ البتہ امیرانِ بہاول پور نے ہر دور میں مزارعین کی ذات اور عزت پر ہونے والی زیادتیوں کا فوری اور سختی سے نوٹس لیا۔

یہاں ، ، ں بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ریاست بہاول پور کی زرعی معیشت کا انحصار نہری آب پاشی کے مؤثر نظام کے بغیر ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اس کا آغاز ۱۸۶۷ء میں ایک سو بیس میل لمبی فورڈ واہ نہر کی تعمیر سے ہوا[۳۷]۔ اگرچہ نواب محمد بہاول خاں خامس کے دور تک دریاؤں سے براہ راست نہریں نکال کر زمینوں کو سیراب کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر ایسی نہریں صرف دریا میں مکمل طور پر پانی آنے کے دوران ہی چلتی تھیں اور پھر ان کے دہانے جلد ہی مٹی اَٹ جانے سے بند ہو جاتے تھے۔ اس طرح پانی کو کنٹرول کرنے کے نظام کی عدم موجودگی کی وجہ سے سیلاب کے دوران فصلیں تباہ ہو جاتیں اور بہت زیادہ علاقہ زیرِ آب آجاتا ۔ علاوہ ازیں ایسی نہروں سے زیادہ رقبہ کی آب پاشی ممکن نہ تھی ۔ اس مقصد کے لیے ریاست کی اٹھائیس لاکھ پچیس ہزار ایکٹر اراضی کو سیراب کرنے کے لیے ''ستلج ویلی پراجیکٹ'' کے نام سے انتہائی ترقی یافتہ نہری نظام کا قیام عمل میں لایا گیا[۳۸]۔ اس منصوبے کی تکمیل اور اجرا کے کچھ ہی عرصے بعد اس کے ثمرات سامنے آئے ۔ ریاست کی سالانہ آمدن اپنی انتہائی حد کو جا پہنچی اور اسے برصغیر کے اناج گھر کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ آب پاشی کے اس جدید منصوبے کی بدولت کم و بیش دس لاکھ انسانوں کو فائدہ ہوا[۳۹]۔ مگر تقسیمِ ملک کے بعد ریاست بہاول پور کو پاکستان سے الحاق کرنے کی یہ سزا دی گئی کہ اس کی سرزمین کو صدیوں سے سیراب کرنے والے دریائے ستلج کے پانی سے محروم کر دیا گیا۔حالانکہ ۱۸۳۳ء کے اینگلو بہاول پور معاہدے کی رُو سے اس دریا پر ریاست بہاو ل پور کے حق کو تسلیم کیا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی کشتیاں بہاول پور کی دریائی گزرگاہ سے گزرنے کے دوران اسے کسٹم ڈیوٹی دینے کی پابند تھیں[۴۰]۔ اسی مؤقف کی بنیاد پر پنجاب باؤنڈری کمیشن کے پاکستانی نمائندے جسٹس دین محمد نے ریاست بہاول پور کے نظام آب پاشی کے حوالے سے دریائے ستلج پر اس کے حق کی بھر پور وکالت کی۔ مگر جیسے ہی ۳۱مارچ ۱۹۴۸ء کو ثالثی کمیشن کی مدتِ کار ختم ہوئی بھارت نے فیروز پور ہیڈ ورکس سے پاکستانی علاقے کو سیراب کرنے والی نہروں کا پانی منقطع کر دیا اس کے نتیجے میں ریاست بہاول پور کو پانی مہیا کرنے والی ''ایسٹرن گرے کینال'' بھی بند کر دی گئی۔ اور اس کے بعد سندھ طاس معاہدہ ۱۹۶۰ء کے مطابق بہاول پور کو دریائے ستلج اور بیاس کے پانی سے محروم کر دیا گیا۔ اس سے آئندہ کے لیے ریاست کی زرعی معیشت پر بہت بُرے اثرات مرتب ہوئے۔ آب پاشی کے نئے

نظام کے تحت بہاول پور کی لاکھوں ایکٹر اراضی کے لیے اس کی ضرورت سے بہت کم پانی مختص کیا گیا۔ موجودہ دور میں ضرورت اس امر کی ہے کہ مستقبل کے مجوزہ ڈیموں سے موجودہ خطۂ بہاول پور کے لیے اتنا وافر کوٹہ مختص کیا جائے جس سے نا صرف اس کے موجودہ زیر کاشت رقبہ کو خاطر خواہ مقدار میں پانی مل سکے بلکہ نئی نہروں کے اجرا سے بہاول پور کے بیس ہزار دو سو مربع کلو میٹر چولستان کو سرسبز و شاداب خطے میں تبدیل کر کے پاکستان کو صحیح معنوں میں ایک زرعی ملک بنایا جا سکے۔

ریاست بہاول پور نے تعمیر و ترقی اور مواصلات کے شعبوں میں خاطر خواہ ترقی کی۔ ۱۸۶۸ء میں پبلک ورکس کے محکمہ کے باقاعدہ قیام کے بعد شاہی اور سول عمارات کی تعمیر کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ سکولوں اور صحت کے مراکز تعمیر کیے گئے[۴۱]۔ ان میں سے اکثر عمارات اب تک دفاتر اور رفاہی اداروں کے طور پر کام آ رہی ہیں۔ خصوصاً نور محل، دولت خانہ، صادق گڑھ پیلس اور بہاول گڑھ کے محلات کا شمار اپنے طرزِ تعمیر کے اعتبار سے برصغیر پاک و ہند کی شاندار عمارات میں ہوتا ہے۔ ریاست بہاول پور کے ادغام اور نواب صادق محمد خاں خامس کی وفات کے بعد سے یہ تمام عمارات شکست و ریخت کا شکار ہو گئیں۔

ان محلات کا طرزِ تعمیر مسلم عہد کی عمارات کے علاوہ یورپ کی اہم عمارات سے مخلوط تھا۔ اس طرح انہیں محرابوں اور دوہری دیواروں سے مضبوطی دی گئی۔ بلند و بالا چھتوں، بالکونیوں، گنبدوں اور جھروکوں سے ان میں عظمت و جلال پیدا کیا گیا۔ طرزِ تعمیر کے اعتبار سے ریاست بہاول پور کی دیگر عمارات میں موجودہ ایس۔ ڈی ہائی سکول اور سنٹرل لائبریری فنِ تعمیر کا نادر نمونہ ہیں۔ دورِ حاضر کے ماہرینِ تعمیرات اور نقشہ ساز ان فنی خصوصیات کو بروئے کار لاتے ہوئے مستقبل کے لیے تعمیر کی جانے والی عمارات کو زیادہ دیدہ زیب اور موسمی و ماحولیاتی ضروریات کے مطابق بنانے میں معاونت فراہم کر سکتے ہیں۔ ریاست نے سرکاری طور پر زیرِ استعمال آنے والی دھاتی، چوبی اور ڈھلائی کی اشیا کی تیاری کے علاوہ برف سازی اور خشت سازی تک میں خود انحصاری کے لیے حکومتی سطح پر کارخانے لگائے۔ یہاں تیار کی جانے والی اشیا بہت معیاری ہوتی تھیں، جن میں مقامی خام مال استعمال کیا جاتا تھا۔ ان میں مقامی کاریگر کام کرتے تھے۔ یہاں نو آموز شاگرد پیشہ نوجوانوں کو عملی تربیت بھی فراہم کی جاتی تھی[۴۲]۔ مگر یہ بات قابلِ افسوس ہے کہ ریاستی حکومت کی طرف سے مقامی خام مال

سے بڑے پیمانے پر صنعتوں کے قیام کے لیے کوئی لائحہ عمل مرتب نہ کیا گیا۔ بلکہ قیام پاکستان کے بعد بھی اس علاقے کو صنعتی اعتبار سے پس ماندہ رکھا گیا۔

ریاست بہاول پور نے فلاحی مملکت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے عوام کی تعلیمی ترقی کے لیے بھرپور کوشش کی۔ ۱۸۶۶ء سے قبل مساجد اور خانقاہوں سے متصل جو دینی تعلیم کے مکاتب قائم تھے، ان کے قیام اور سرپرستی میں امیرانِ بہاول پور نے بھرپور معاونت فراہم کی۔ مگر بدلتے ہوئے حالات کے مطابق جدید انگریزی تعلیم کی ترویج کی ضرورت تھی۔ جس کا آغاز ۱۸۶۷ء میں مشن سکول بہاول پور کے قیام سے ہوا[۴۳]۔ اس کے نصاب میں انگریزی کے ساتھ ساتھ فارسی اور اردو کی تعلیم بھی شامل تھی۔ مگر یہ اینگلو ورنیکلر سکول چونکہ تمام ریاست کی تعلیمی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے ۱۸۶۸-۶۹ء کے دوران ریاست کے تمام اہم شہروں میں ورنیکلر سکولوں کا قیام عمل میں آیا۔ پہلی ایجنسی کے دور کو ریاست میں جدید تعلیم کا نقطۂ آغاز کہا جا سکتا ہے۔ اس بارہ سالہ ارتقائی عرصہ کے دوران ۱۸۷۰ء میں محکمہ تعلیم کا قیام عمل میں آیا[۴۴]۔ یکم اگست ۱۸۷۱ء سے اساتذہ کی تربیت کے لئے مدرسۃ المعلمین (نارمل سکول) بہاول پور کا قیام عمل میں آیا۔ اس مدرسہ میں نا صرف دیہی سکولوں کے اساتذہ اور ورنیکلر سکولوں کے فارغ التحصیل طلبا کو علم تدریس کی تعلیم دی جاتی تھی بلکہ اس کا دوسرا حصہ اینگلو ورنیکلر مڈل سکول کا درجہ رکھتا تھا[۴۵]۔ اس طرح مشن سکول کے بعد یہ ریاستی وسائل سے قائم ہونے والا دوسرا مڈل سکول تھا جہاں انگریزی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ وہی ادارہ تھا جس کے ''مدرسۃ المعلمین'' نے نہ صرف ریاست بھر کے ابتدائی تعلیم کے دیہی سکولوں کے اساتذہ کو تربیت فراہم کرنے میں معاونت فراہم کی بلکہ نئے اساتذہ کی کھیپ بھی تیار کی۔ اگرچہ برطانوی ہند کے ٹیچرز ٹریننگ سکولوں کے مقابلے میں یہ کم معیار کا ادارہ تھا، مگر اس سے منسلک اینگلو ورنیکلر مڈل سکول اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ اس نے ۱۸۸۲ء میں ریاست کے پہلے ہائی سکول (ایجرٹن ہائی سکول) اور ۱۸۸۶ء میں ریاست کے پہلے کالج (صادق ایجرٹن کالج) کے درجے پر ترقی حاصل کی۔ اس دور میں انہی اداروں کی بدولت بہاول پور کو لاہور کے بعد ایک اہم علمی مرکز کی حیثیت حاصل ہوئی۔ ہم بجا طور پر یہ بات کہنے میں حق بجانب ہیں کہ جس وقت سرسید احمد خان برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے کوشاں تھے، عین اُسی وقت ریاست بہاول پور اس خطے میں انہی مقاصد کی تکمیل میں

مصروف تھی۔صادق ایجرٹن کالج کا قیام ایک انقلابی قدم تھا ،بالکل ویسا ہی جیسا کہ علی گڑھ کے ایم۔اے۔او ہائی سکول اور کالج کا قیام ۔ایک ایسے وقت جب کہ لاہور سے کراچی کے درمیان اس مسلم اکثریت کے خطے میں ہائی سکول نہ ہونے کے برابر اور کسی کالج کا وجود بالکل نہ تھا ۔ریاست بہاول پور نے اعلیٰ تعلیم کی ترویج میں بھر پور معاونت فراہم کی ۔یہاں تعلیم حاصل کرنے والوں میں ملتان ،مظفر گڑھ،ڈیرہ غازی خان، جھنگ ،میانوالی ،راولپنڈی،ساہیوال اور جالندھر تک کے طلبا شامل تھے ۔یہاں مقامی اور غیر مقامی طلبا کو بلاتخصیص داخلہ ،وظائف اور فیس معافی جیسی رعایت میسر تھی۔ان اداروں میں اپنے قیام سے ہی ہاسٹل،کھیلوں اور لائبریری کی سہولت موجود تھی[۴۷]۔۱۹۰۷ء میں پہلی بار کالج کا الحاق پنجاب یونیورسٹی سے ہوا۔ اس کے بعد ہر سال یونیورسٹی کی معائینہ کار کمیٹی بھیجی جاتی اور اس کی سفارش پر الحاق کی تجدید کی جاتی تھی۔ ایس۔ ای۔ کالج بہاول پور کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ۱۹۱۱ء میں میاں محمد شفیع ،۱۹۱۳ء میں فضلِ حسین اور۳ فروری۱۹۱۴ء کو علامہ محمد اقبالؒ جیسی صفِ اول کی شخصیات نے ا س کا معائینہ کیا اور کالج کی تعمیر و ترقی کے لیے تجاویز پیش کیں[۴۸]۔اگرچہ ایک اسلامی ریاست ہونے کے ناطے اس کے طول و عرض میں بے شمار دینی تعلیم کے مکاتب قائم تھے مگرانیسویں صدی کے نصف آخر میں جدید تعلیم کی ترویج کے ساتھ ساتھ سرکاری سرپرستی میں دینی مدارس کا ایک مربوط نظام بھی قائم کیا گیا ۔اس مقصد کے لئے ریاست کی ایجوکیشنل کمیٹی نے۱۸۸۲ء میں درسِ نظامی کے علاوہ مدرسۂ دیوبند اور مدرسۂ مظاہر العلوم سہارن پور سے رہنمائی لیتے ہوئے دینی مدارس کا نصاب مرتب کیا اور دس اہم شہروں میں مدارسِ عربیہ اور مدارسِ دینیات کے نام سے مُعارفِ اسلامیہ کے ادارے قائم کیے گئے[۴۹]۔ان میں سب سے اہم بہاول پور کا مدرسۂ عربیہ تھا جس کے پہلے مہتمم مشہور عالم دین مولوی خلیل احمد سہارن پوری تھے۔اگرچہ اس مدرسے کا قیام۱۸۷۹ء میں ہوا تھا مگر ریاست کے پہلے ہائی سکول اور کالج کے قیام کے بعد اسے ان اداروں کے شعبۂ علومِ اسلامیہ کی حیثیت حاصل ہوئی۔یہی وہ شعبہ تھا جسے۱۹۲۵ء میں جامعۂ عباسیہ کے نام سے حیدر آباد دَکن کی جامعۂ عثمانیہ اور مصر کی جامعۂ الازہر کی طرز پر مدون کیا گیا۔ یہ جامعہ دینی علوم کی عظیم درس گاہ تھی جہاں دُرود، رُشد ،عبور، فوض، مہارت اور تحقیق کے نام سے پرائمری سے لے کر پی۔ ایچ۔ ڈی تک کے درجہ کی تعلیم کا انتظام تھا۔ اس کے فارغ التحصیل طلبا کو ''علامہ'' کے خطاب

سے معنون کیا جاتا تھا۔ اس درس گاہ میں دینی اور مشرقی علوم کے علاوہ انگریزی تعلیم کا بھی اہتمام تھا۔ علاوہ ازیں طب مشرقی یا طب یونانی کے حکما کی تربیت کے لیے'' عباسیہ طبیہ کالج'' کے نام سے علیحدہ شعبہ قائم تھا۔ اس طرح اس کا شعبۂ ''شیخ التشریع الاسلامی'' فتویٰ نویسی کی تعلیم کے علاوہ عوام کی رہنمائی کے لیے فتاویٰ جات بھی جاری کرتا تھا۵۰۔ جامعہ کو برصغیر پاک و ہند کے نامور علماءِ کرام کی خدمات میسر رہیں۔ اس کے نصاب کی تدوینِ نو میں سید سلیمان ندوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد انصاری اور اورنٹیل کالج لاہور کے مولانا محمد شفیع جیسے نامور اصحاب شامل تھے۵۱۔

ریاست کی طرف سے ملنے والی بھر پور مالی معاونت کے باعث جامعۂ عباسیہ نے بہت ترقی کی۔ یہاں علم حاصل کرنے کے لیے برصغیر پاک و ہند کے علاوہ افغانستان تک سے طلبا آتے تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ریاست میں بشمول جامعہ تمام مدارسِ عربیہ میں مفت تعلیم کا انتظام تھا۔ اس جامعہ کے ساتھ ریاست کے متعدد دینی مدارس کا الحاق تھا۔ یہاں کے فارغ التحصیل علماءِ کرام کسی خاص مسلک کی تبلیغ یا اسلام کی فروعات پر بحث وتمحیص کی بجائے اُمتِ مسلمہ میں اتحاد و یگانگت کے جذبے کی آبیاری کرتے تھے۔۱۹۶۴ء میں جامعہ عباسیہ کا نام بدل کر جامعۂ اسلامیہ رکھا گیا جب کہ ۱۹۷۵ء میں اس کی خالصتاً دینی حیثیت ختم کر کے اسے ''اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور'' کے نام سے معنون کر دیا گیا۔

ریاست بہاول پور خواتین کی مذہبی تعلیم کی اہمیت سے بھی آگاہ تھی۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے۱۸۸۴ء میں ایک مدرسہ قائم کیا گیا جہاں قرآن پاک کی تدریس کے علاوہ روز مرہ کے شرعی مسائل کی تعلیم کا انتظام بھی تھا۵۲۔ اس طرح۱۹۰۶ء میں پہلی بار لڑکیوں کی جدید تعلیم کے لیے گرلز سکول قائم کیا گیا۵۳۔ یہ یقیناً ایک انقلابی قدم تھا۔ کیونکہ ریاست کا دقیانوسی معاشرہ عورتوں کی تعلیم کا مخالف تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مقامی آبادی کو خواتین کی تعلیم کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ اس نقطۂ نظر کی ترویج میں ریاست کے پہلے گرلز سکول نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ کونسل آف ریجنسی (۱۹۰۷ء تا۱۹۲۴ء) کے دور میں مزید تعلیمی اصلاحات کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ بات باعثِ تشویش تھی کہ ریاست میں تعلیمی ادارے تو موجود تھے مگر تعلیم کے درجات بڑھنے کے ساتھ ساتھ ریاستی طلبا کی تعداد میں بتدریج کمی اور غیر ریاستی طلبا کے تناسب میں اضافہ کا رُجحان پایا جاتا تھا۔ مثلاً پرائمری

درجہ میں تو مقامی طلبہ اٹھانوے فی صد تھے۔ مگر ہائی سکول میں ان کا تناسب تینتالیس فی صد اور کالج میں ان کی تعداد صرف پندرہ فی صد تھی۔ اس طرح اعلیٰ درجہ کی تعلیم میں ریاستی مسلم طلبا کا تناسب ، ریاستی ہندو طلبا کے مقابلے میں انتہائی کم تھا۔ مثلاً کالج میں صرف دو فی صد مقامی مسلمان طلبا داخل تھے۔ جب کہ مقامی ہندو طلبا کی تعداد تیرہ فی صد تھی۵۴۔

نواب صادق محمد خاں خامس کے دور میں تعلیم کے شعبے کو اپنی معراج تک پہنچایا گیا۔ اگر آپ کو اپنے عہد کا سرسید کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ اس دور میں تعلیم کی وزارت قائم کی گئی اور اس عہدے پر علی گڑھ کے ایک پوسٹ گریجویٹ فارغ التحصیل کو تعینات کیا گیا۔ اگرچہ اس عہد میں ریاست ستلج ویلی پراجیکٹ اور جنگِ عظیم دوم کی وجہ سے شدید معاشی بحران کا شکار رہی مگر اس کے باوجود تعلیم کے فروغ سے پہلو تہی اختیار نہ کی گئی۔ تعلیمی ذمہ داریوں میں بلدیاتی اداروں کو شامل کیا گیا۔ پرائمری تعلیم کو لازمی قرار دے دیا گیا۵۵۔ نواب مذکورہ کے دور میں کالج کی تعلیم میں بھی دوررس تبدیلیاں عمل میں آئیں۔ ۱۹۴۵ء میں بہاول نگر میں ریاست کا دوسرا کالج قائم ہوا۵۶۔ ایس ۔ای ۔ کالج کے تقسیمِ اسناد کے جلسوں میں سید سلیمان ندوی، خلیفہ شجاع الدین، ایس۔ پی سنہا، ڈاکٹر ہادی حسن ، ڈاکٹر ضیاء الدین اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسی نامور شخصیات کو مدعو کیا جاتا رہا۵۷۔ اس کالج نے کھیلوں میں بھی خوب نام پیدا کیا۔نواب صادق محمد خاں خامس کے دور میں خواتین کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی۔ ریاست کے پاکستان سے الحاق کے وقت ریاست بھر میں اٹھائیس گرلز سکول قائم تھے جہاں ایک ہزار ایک سو چونسٹھ طالبات زیرِ تعلیم تھیں۵۸۔ یقیناً ایک ایسا معاشرہ جہاں عورتوں پر کئی طرح کی قدغنیں عائد تھیں ، اس میں ان کے لیے تعلیم کے دروازے واء ہو جانا ایک مثبت پیش رفت تھی۔ نواب صادق محمد خاں خامس کے دور میں فنی، زرعی ، کمرشل اور نابینا افراد کی تعلیم کے اداروں کا قیام عمل میں آیا۔۱۹۴۰ء میں ''سب آرڈی نیٹ انجینیئرنگ کالج'' کے قیام سے مقامی طور پر ریاست کے محکمۂ انہار ،پبلک ورکس ، کارخانہ جاتِ سرکاری اور جنریٹنگ اسٹیشن کے لیے سب انجینئرز کی کھیپ تیار کرنے میں مدد ملی۵۹۔ یہی وہ ادارہ تھا جس نے بعد ازاں ''پولی ٹیکنک'' کا درجہ حاصل کیا۔ اس طرح۱۹۴۲ء میں اہلِ فن و حرفہ کی تربیت کے لیے بہاول پور میں انڈسٹریل سکول کے قیام سے صنعتی اشیاء کی تیاری کا آغاز ہوا۶۰۔ جب کہ۱۹۴۶ء میں زراعتی تربیت کے ادارے کے قیام سے

زراعت پیشہ افراد کو جدید طریقہ ہائے کاشت سے آگاہی ملی[۶۱]۔ ۱۹۴۵ء میں ''صادق کمرشل انسٹی ٹیوٹ'' کے قیام سے تربیت یافتہ دفتری عملے کی فراہمی میں مدد ملی۔ ریاست نے ۱۹۴۳ء میں نابینا افراد کی تعلیم اور انہیں پیشہ ورانہ تربیت فراہم کرنے کے لیے سکول قائم کیا جسے اقوامِ متحدہ کی طرف سے ایشیاء بھر میں اپنی نوعیت کا بہترین ادارہ قرار دیا گیا[۶۲]۔ اس کے علاوہ ریاست میں شرحِ خواندگی کو بڑھانے کے لیے ۱۹۳۹ء میں تعلیمِ بالغاں کے پروگرام کو پورے شدومد سے شروع کیا گیا[۶۳]۔ مگر اسی دور میں انجینئرنگ، میڈیکل، زراعت اور قانون کی اعلیٰ تعلیم کا کوئی ادارہ قائم نہ ہو سکا۔ چنانچہ ان علوم کی تحصیل کے لیے باصلاحیت نوجوانوں کو وظائف پر اندرون ملک اور برطانیہ بھیجا جاتا تھا۔ یہی وہ ماہرین تھے جنہوں نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ریاست کی تعمیر و ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ تعلیم کے فروغ میں کتب خانوں کے قیام کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بہاول پور میں صادق ریڈنگ لائبریری کے علاوہ سترہ دیگر چھوٹے بڑے کتب خانوں اور ریڈنگ رومز نے تعلیمی ترقی میں بھرپور معاونت فراہم کی[۶۴]۔

ریاست بہاول پور میں باقاعدہ طور پر عوام کو طبی سہولیات کی فراہمی کا آغاز ۱۸۶۷ء میں ہوا[۶۵]۔ تربیت یافتہ ڈاکٹروں اور پیرا میڈیکل عملے کی عدم دستیابی اور ہسپتالوں کے لیے عمارات کی غیر موجودگی جیسے مسائل درپیش تھے۔ چنانچہ اس صورتِ حال میں محکمۂ صحت کا قیام عمل میں آیا، جو اپنے آغاز میں صرف ایک چیف میڈیکل آفیسر، ایک کلرک اور ایک چپڑاسی پر مشتمل تھا، مگر انیسویں صدی کے اختتام تک بہاول پور کے صدر ہسپتال کے علاوہ دیگر آٹھ بڑے شہروں میں شفاخانے قائم ہو چکے تھے جہاں جدید طریقۂ علاج مروج تھا۔ بہاول پور اور خان پور کے ہسپتالوں میں تو بڑے آپریشن بھی کیے جاتے تھے۔ دماغی امراض میں مبتلا افراد کے علاج کے لیے چھ ہسپتالوں میں علیحدہ وارڈز مختص تھے۔ اگرچہ خواتین کو ہر ہسپتال میں علاج معالجے کی سہولت مُیسر تھی مگر ۱۸۹۲ء میں زنانہ جوبلی ہسپتال کے نام سے دارالحکومت میں ایک بڑا ہسپتال قائم کیا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں اسے ایک بڑی عمارت میں منتقل کیا گیا تو خواتین کو وسیع پیمانے پر پہلے سے زیادہ بہتر ماحول میں جدید طبی سہولتیں میسر آئیں۔ اس طرح ۱۹۳۵ء میں بہاول نگر میں اور ۱۹۴۵ء کے دوران احمد پور شرقیہ میں بھی علیحدہ سے زنانہ ہسپتالوں کا قیام عمل میں آیا[۶۶]، جن کی علیحدہ حیثیت قیام پاکستان کے بعد ختم کر دی گئی۔ خواتین کے ان تمام

علیحدہ ہسپتالوں کی ضرورت اس لیے زیادہ تھی کہ مقامی معاشرے میں عورتوں کا مرد معالجین سے علاج کرانا انتہائی معیوب اور باعث شرم سمجھا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ عمومی امراض کے علاج کے لیے بھی عورتیں ڈاکٹر کے سامنے آنے کی بجائے وہاں پر تعینات دائیوں کو اپنے مرض کی کیفیت بیان کرتیں اور بالواسطہ طور پر دوائی حاصل کرتیں ۔ اس صورت حال میں خصوصیت سے امراضِ نسواں کے علاج اور زچگی کے مقاصد کے لیے زنانہ ہسپتالوں کا قیام ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ ریاست بہاول پور کے محکمہ صحت کی طرف سے چیچک، طاعون ، ہیضہ ، ملیریا اور دیگر امراض اکثر وبائی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ ان کے تدارک کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی جاتی، ویکسین کا استعمال ، جراثیم کشی کا طریقہ، وبائی امراض میں مبتلا افراد سے دوسرے لوگوں کو محفوظ رکھنے کے لیے قرنطینہ کے انتظامات، مکھیوں ، مچھروں اور موذی جانوروں کے اتلاف کا انتظام محکمۂ صحت کے فرائض میں شامل تھا۔ ریاست کی میونسپل کمیٹیاں شہروں میں صفائی اور حفظانِ صحت کے قواعد پر عمل درآمد کے سلسلے میں چیف میڈیکل آفیسر کے تابع تھیں، جسے چیف سینٹری انسپکٹر اور ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ کے اختیارات حاصل تھے۶۷۔ اس طرح موجودہ دور میں خطرناک بیماریوں اور وباؤں کی روک تھام کے لیے محکمۂ صحت اور بلدیاتی اداروں کو باہمی اشتراک سے حکمت عملی مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔۱۸۶۸ء میں محکمۂ صحت کو موسمیات کا شعبہ بھی تفویض کیا گیا۔ بہاول پور کے صدر ہسپتال میں نصب آلات کی مدد سے موسمیاتی کیفیت کا ریکارڈ اکٹھا کرنے کے علاوہ ریاست کے تمام اہم مقامات کے موسمی حالات کی تفصیلات بھی جمع کی جاتی تھیں اور انہیں ریاست کے *صادق الاخبار گزٹ* میں شائع کیا جاتا تھا۔اس موسمیاتی ریکارڈ کی مدد سے متوقع بیماریوں اور وباؤں کا اندازہ لگانے اور ان سے تحفظ کے لیے پیش بندی کر لی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں اس سے فصلوں کی کاشت سے متعلق رہنمائی بھی حاصل کی جاتی تھی۔ ۱۸۷۰ء میں محکمۂ صحت کو شرحِ پیدائش اور اموات کا ریکارڈ مرتب کرنے کی ذمہ داری بھی سونپی گئی۶۸۔ اس سے افزائشِ آبادی کے مطابق مستقبل کی منصوبہ بندی میں مدد ملتی تھی۔ ۱۸۷۲ء سے محکمۂ صحت نے عدلیہ کو فوجداری مقدمات میں معاونت فراہم کرنے کے لیے ''شعبۂ طب قانونی'' کا اجراکیا۶۹۔ اس شعبے کو مزید ترقی اس وقت ملی جب۱۹۴۰ء میں اس مقصد کے لیے ''مرکزی تجزیاتی لیبارٹری'' کا قیام عمل میں آیا۔اس لیبارٹری میں مریضوں کے بعض پیچیدہ ٹیسٹ بھی کیے جاتے

تھے۷۰۔ یہ اعزاز ریاست بہاول پور کو حاصل ہے کہ اس کے عوام کو بلا تخصیص مفت علاج معالجے کی سہولت میسر رہی۔ ہر قسم کی ادویات سرکاری شفا خانوں سے فراہم کی جاتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عرصہ تک ریاست بھر میں نہ تو کوئی میڈیکل سٹور قائم ہوا اور نہ ہی کسی کیمسٹ کی دوکان کھلی۔ اپریشن کی صورت میں تمام تر انتظام و انصرام ہسپتال انتظامیہ کی ذمہ داری میں شامل تھا۔ ان ڈور مریضوں کو معیاری یا پرہیزی خوراک اور دودھ تک فراہم کیا جاتا تھا۔ انہیں آلودگی سے پاک لباس بھی مہیا کیا جاتا تھا۔ ریاست بہاول پور کی یہ رفاہی حکمت عملی اس قدر عوامی مقبولیت کی حامل تھی کہ اسے ریاست کے ون یونٹ میں ادغام کے کافی عرصہ بعد تک جاری رکھنا پڑا۔اس طرح موجودہ دور کے ڈاکٹروں کے عمومی مادیت پرستی کے رویے کے برعکس اس دور کے ڈاکٹروں میں ایثار وقربانی کا جذبہ اس قدر موجزن تھا کہ وہ ہمہ وقت دُکھی انسانیت کی خدمت کو اپنا فریضہ تصور کرتے تھے۔ وہ ہسپتال کے اوقات کے علاوہ بھی اپنے گھروں پر مریضوں کا بغیر فیس علاج کرتے۔ لاچار مریضوں اور مستورات کی درخواست پر ان کے گھروں پر پہنچ کر ان کا بلا معاوضہ معائینہ کرتے۷۱۔ دراصل ریاست کی طرف سے محکمۂ صحت کے عملے کو شروع سے ہی دُکھی انسانیت کی خدمت کے لیے خود کو وقف رکھنے کے لیے قواعدمرتب کیے گئے۔ چنانچہ انہیں اپنی پیشہ ورانہ خدمات کی ادائیگی میں سہولت بہم پہنچانے کے لیے ہسپتال کے احاطہ میں ہی رہائش گاہیں فراہم کی گئیں، تاکہ کسی بھی ایمرجنسی کی صورت میں انہیں مریضوں تک پہنچنے میں کسی قسم کی تاخیر نہ ہو۔ وہ پابند تھے کہ اپنے اوقات کار کا زیادہ سے زیادہ حصہ مریضوں کے ساتھ گزاریں۔ ایسے مریض جن کے ساتھ ان کے لواحقین موجود نہیں ہوتے تھے۔ ان کی تیمار داری کا تمام تر فریضہ ہسپتال ملازمین کے سپرد تھا۔ ریاست بہاول پور میں ۱۹۴۷ء تک سرکاری ڈاکٹروں کی پرائیویٹ پریکٹس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ مگر اس کے برعکس موجودہ دور کے سرکاری ڈاکٹروں نے پرائیویٹ پریکٹس کو اپنا حق بنا لیا ہے۔ ان میں سے بیشتر نے ہسپتالوں میں تفویض کردہ منصبی ذمہ داری کو دل جمعی سے انجام دینے کے بجائے اپنی سرکاری رہائش گاہوں کو پرائیویٹ پریکٹس کے مراکز میں تبدیل کر ڈالا ہے، ان کے پرائیویٹ کلینک اور اپریشن تھیٹر بلا حیل و حجت دکھی اور مجبور انسانیت کی خدمت کی بجائے ان کا جبراً استحصال کرنے میں مصروف ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ قیام پاکستان کے بعد کم از کم اس مقدس پیشے سے منسلک افراد پہلے سے بھی زیادہ خدمت کو اپنا نصب العین بناتے۔

موجودہ دور میں ضرورت اس امر کی ہے کہ ریاست بہاول پور کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے عوام کو علاج معالجے کی مفت سہولیات بہم پہنچائی جائیں۔ خصوصاً صحت کے پیشے سے منسلک افراد جو سرکاری ملازمت سے وابستہ ہیں کی پرائیویٹ پریکٹس پر بندش لگائی جائے۔ کیوں کہ ان کی تعلیم و تربیت پر قوم کا ایک زرِ کثیر صرف ہوا ہے۔ علاوہ ازیں وہ اپنی خدمات کا معاوضہ بھاری تنخواہوں کی صورت میں وصول کرتے ہیں۔ لہٰذا سرکاری طبی عملہ کو اپنی تمام تر توجہ صرف اور صرف ہسپتال میں خدمات کی بجا آوری تک محدود رکھنے کے لیے قانون سازی کی ضرورت ہے۔

ریاست بہاول پور نے اپنے عوام کے جان و مال کو تحفظ فراہم کرنے اور انہیں ہر قسم کے جبرو استحصال سے محفوظ کرنے کے لیے ایک مؤثر عدالتی نظام رائج کیا۔ ریاست کے ابتدائی دور میں قاضیوں کی عدالتیں قائم تھیں جہاں اسلامی قوانین و تعزیرات کے مطابق فیصلے کیے جاتے تھے۔ البتہ ہندو اقلیت کے باہمی تنازعات کا تصفیہ ہر علاقے کے برہمن یا مکھی اپنے شخصی قوانین (دھرم شاستر) کے مطابق کرتے تھے۔ تاہم ۱۸۶۶ء میں پہلی بار ریاست میں عدالتوں کی فوجداری اور دیوانی عدالتوں میں تقسیم ہوئی۔ فوجداری مقدمات کو قابلِ ضمانت اور ناقابلِ ضمانت جرائم میں تقسیم کیا گیا۔ لیکن فوجداری اور شخصی معاملات میں عدالتوں کو قاضیوں کے فتویٰ کی روشنی میں فیصلہ کرنے کی ہدایت تھی[۷۲]۔ ۱۸۷۱ء میں ایک مثبت تبدیلی یہ کی گئی کہ عدلیہ اور انتظامیہ (مالیہ) کے شعبوں کو علیحدہ کر دیا گیا۔ اس طرح ججوں کی استعداد کار بڑھانے کے لیے انہیں کچھ عرصہ بعد محکمانہ امتحان پاس کرنا ہوتا تھا۔ ۱۸۷۴ء میں ضوابطِ دیوانی اور فوجداری حکومت ہند کے نفاذ سے ریاست کے عدالتی نظام کو برطانوی ہند میں مروج نظام سے ہم آہنگ کرنے میں مدد ملی۔ اس نظام کے کاملاً نفاذ کے لیے نئے سرے سے عدالتوں کی تشکیل ہوئی۔ ''صدر عدالت'' کے نام سے تین ججوں پر مشتمل عدالتِ عالیہ کا قیام عمل میں آیا[۷۳]۔ اسے اپنی ماتحت عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیل کی سماعت کا اختیار حاصل تھا۔ اس کے علاوہ اسے عدالتِ نگرانی اور عدالتِ سیشن کے اختیارات بھی حاصل تھے۔ یہی وہ عدالت تھی جسے ۱۹۱۰ء میں ''چیف کورٹ'' اور ۱۹۳۷ء سے ''ہائی کورٹ'' کا درجہ حاصل ہوا[۷۴]۔ اس طرح سابقہ دور کی اعزازی ''کمیٹی کی عدالتیں'' بھی قائم رکھی گئیں، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب ان کے ممبران کی طرف سے ناجائز طرف داری اور عدالتی کام میں عدمِ دلچسپی کی شکایات پیدا ہونے لگیں تو ان کی تعداد میں

بتدریج کمی کرتے ہوئے بالآخر ۱۸۷۶ء میں انہیں بالکل ختم کر دیا گیا۷۵۔ ان مصالحتی عدالتوں کی بڑی افادیت تھی کیونکہ ان کے ذریعے بیشتر مقدمات کا فیصلہ بڑے احسن طریقے سے مقامی طور پر ہی طے پا جاتا تھا۔ اس طرح عام عدالتوں پر کام کا بوجھ کم کرنے میں مدد ملتی تھی۔ اگر ان عدالتوں کو ختم کرنے کی بجائے ان کے نظامِ کار میں اصلاح کی جاتی تو اس طرح مقامی طور پر ہی لوگوں کو مفت، فوری اور سہل انصاف کی فراہمی کا سلسلہ جاری رہتا۔ کیوں کہ یہ نظام صدیوں سے عوام کے مزاج میں رسوخ رکھتا تھا، اس لیے پنچایتی عدالتوں کی افادیت کے پیشِ نظر ۱۹۴۳ء سے تمام دیہی علاقوں میں ان کی تشکیل عمل میں آئی۷۶۔ پنچایتوں کے قیام، ان کے فیصلوں اور ان پر عمل درآمد نیز ان عدالتوں کے ممبران کے تقرر، اہلیت اور اختیارات سے متعلق قواعد مرتب ہوئے۔ پنچایتی عدالتیں ریاست کے ون یونٹ میں ادغام تک قائم رکھی گئیں۔ بہتر ہوتا کہ پنچایتی نظام میں مزید اصلاحات نافذ کی جاتیں اور نہ صرف دیہاتی علاقوں میں بلکہ شہروں میں بھی مصالحتی عدالتیں تشکیل دی جاتیں۔ نواب صادق محمد خاں خامس کے دور میں ریاست میں ''ریونیو کورٹس'' علیحدہ سے قائم تھیں۔ مگر ان کے فیصلوں کے خلاف اپیل کی سماعت کا اختیار صدر عدالت کی بجائے مشیرِ مال کی عدالت کو حاصل تھا۷۷۔ یقیناً یہ بات قرینِ انصاف نہ تھی کہ مالیاتی اُمور سے متعلق کسی ناانصافی یا بے قاعدگی کی صورت میں ریاست کی عدالتِ عالیہ تک کو نگرانی یا فیصلہ پر نظر ثانی کا اختیار حاصل نہ ہو۔ ریاست بہاول پور میں سپریم کورٹ کے اختیارات عبوری حکومتوں کے دوران ان کے سربراہان کو حاصل ہوتے تھے۔ مگر امیرانِ بہاول پور کے تخت نشین ہونے کے بعد یہ اختیارات انہیں منتقل ہو جاتے تھے۷۸۔ اپنی اسی حیثیت سے انہیں تمام دیوانی، فوجداری اور مالیاتی اپیلوں کے قطعی فیصلے کے علاوہ سزائے موت کی صورت میں رحم کی اپیل پر سزا کی معافی، تبدیلی یا اس کی توثیق کا اختیار حاصل تھا۔ تاہم ہر دور کے حکمران نے عدلیہ کے ان بالاتر اختیارات کے استعمال سے متعلق انفرادی طریقۂ کار وضع کیا۔ نواب صادق محمد خاں رابع سپریم کورٹ کے اختیارات اپنے وزیراعظم کی رائے سے استعمال کرتے تھے۷۹۔ جب کہ نواب محمد بہاول خاں خامس نے اپنی انتظامی کونسل کے تین ممبران کو سپریم کورٹ کا درجہ دیا، جن کے فیصلوں کی توثیق وہ خود کرتا تھا۔ نواب صادق محمد خاں خامس کے دورِ حکومت کے ابتدائی سترہ سالوں(۱۹۲۵ء تا ۱۹۴۲ء)کے دوران عدالتِ عظمیٰ کے اختیارات اس کی کابینہ کو حاصل

تھے۔ اس مقصد کے لیے چیف منسٹر کی صدارت میں ''اجلاسِ خاص'' منعقد ہوتا، جس میں اپیلوں یا نظرثانی کی درخواستوں کو ممبرانِ کابینہ کی رائے کے لیے پیش کیا جاتا اور کسی متفقہ فیصلہ پر پہنچنے کے بعد ہر رکن اپنی رائے تحریر کرتا، جسے قانونی حیثیت نواب کے توثیقی دستخطوں سے حاصل ہوتی تھی۔۱۹۴۲ء میں اس مقصد کے لیے ''جوڈیشل کمیٹی'' تشکیل دی گئی۔ اس میں ریاست کے چیف جسٹس کے علاوہ کابینہ کے تین لاء گریجویٹ ارکان کو شامل کیا گیا ، جو ہائی کورٹ کے جج یا چیف جسٹس رہ چکے تھے۔ اس میں اقلیتوں کی نمائندگی کے لیے ایک ہندو وزیر بھی شامل کیا گیا۸۰۔ اس اعتبار سے ریاست کے آخری دور میں قائم اعلیٰ اختیارات کی عدالتِ انصاف اپنی ساخت اور کارکردگی کے اعتبار سے انتہائی صلاحیت کی مالک تھی۔ نواب صادق محمد خاں خامس نے ہمیشہ ''جوڈیشل کمیٹی'' کی تجاویز سے اتفاق کیا اور کبھی بھی اپنے صوابدیدی اختیارات کے ذریعے اس کے فیصلوں کو تبدیل کرنے کی کوشش نہ کی۔موجودہ دور میں یہ بات قرینِ انصاف نہیں کہ سپریم کورٹ کی طرف سے سنائی جانے والی سزائے موت کی سزا میں معافی کا اختیار صدرِ مملکت کی ذات کو تفویض کردیا جائے اور وہ اس سلسلے میں کسی سے مشورہ لینے کا پابند نہ ہو۔ ریاست کی عدالتِ عالیہ میں انتہائی نامور ججوں نے خدمات انجام دیں۔ ان ججوں کے مشہور فیصلے آج تک زبانِ زدِ عام و خاص ہونے کے علاوہ عدالتی نظائر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان ججوں کی فہرست میں خصوصیت سے سید مراد شاہ(۱۸۷۰ء تا ۱۸۷۶ء)، مولوی محمد دین (۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۹ء)، میرسراج الدین (۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۴ء)،مولوی فضل حسین(۱۹۲۶ء تا ۱۹۴۲ء)، محمد اکبر(۱۹۳۶ء تا ۱۹۴۶ء)، سر عبدالقادر(۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۶ء) اور شیخ دین محمد(۱۹۴۶ء تا ۱۹۴۸ء) شامل ہیں۔ آخری دو ججوں نے تو پنجاب ہائی کورٹ سے سبکدوش ہونے کے بعد ریاست بہاول پور میں خدمات انجام دیں۔ ریاست میں ججوں کو بہت عزت و تکریم حاصل تھی، انہیں معقول مشاہرہ جات ملتے تھے۔ ان ججوں نے بھی اپنے پیشے سے خوب انصاف کیا اور اپنے ذاتی کردار کی وجہ سے بدعنوانی سے دور رہے۔ ان کی دیانت داری کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوسکتی ہے کہ چیف جج سید مراد شاہ اور سید فیض الحسن دورانِ ملازمت مقروض فوت ہوئے اور ان کا قرض ریاست نے ادا کیا ۔ ان ججوں کی اپنے پیشے سے لگن، انصاف پروری، دیانت داری ، لیاقت اور بے باکی موجودہ دور کے ججوں کے لیے قابلِ تقلید مثال کا درجہ رکھتی ہے۔

ریاست بہاول پور میں نئے عدالتی ڈھانچے کی تشکیل کے ساتھ ہی کچھ ایسے ضوابط سامنے آئے

جو عوام کے لیے قطعاً پسندیدہ نہ تھے۔ ان میں خصوصیت سے ۱۸۷۱ء سے نافذ العمل کورٹ فیس اور اسٹامپ ایکٹ کا نفاذ سرِفہرست ہیں۸۱۔ ریاستی عوام ایک سو تینتالیس سال(۱۷۲۷ء تا ۱۸۷۰ء) سے بالکل مفت انصاف کا حق استعمال کرتے آئے تھے۔ خود امیرانِ بہاول پور بھی بلامعاوضہ انصاف کی فراہمی کو اپنی حکومت کا بنیادی فریضہ تصور کرتے تھے۔ کورٹ فیس کے اطلاق نے ریاستی عدلیہ کو ہمیشہ کے لیے بھاڑے کی ادائیگی پر خدمات انجام دینے والا ادارہ بنا ڈالا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے ضوابط بھی نافذ کیے گئے جن سے مروج عدالتی نظام کی اصلاح ہوئی اور بالواسطہ طور پر عوام کو بھی فائدہ پہنچا۔مثلاً ریاست میں شروع سے ہی فریقینِ مقدمہ کی طرف سے وکلا کو عدالتوں میں پیش ہونے پر پابندی لگا دی گئی تاکہ مقدمہ بازی کے رُجحان کو کم کیا جا سکے اور اس کی وجہ سے عوام مفلس ہونے سے بچ جائیں۸۲۔ علاوہ ازیں وکلا کی غیر موجودگی کی وجہ سے لوگ نہ صرف ان کی بھاری فیسوں سے بچے ہوئے تھے بلکہ اس طرح ججوں کو محض حقائق ، شہادتوں اور بیانات کو سامنے رکھ کر زیادہ قرینِ انصاف اور فوری فیصلے کرنے میں آسانی ہوتی تھی۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب عدالتی طریقۂ کار میں پیچیدگی کی وجہ سے قوانین کی تشریح و توضیح کی ضرورت محسوس ہوئی اور مقدمات کی تعداد میں اضافہ ہوا تو وکلا کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ پہلی بار بہاول پور لیگل پریکٹیشنرز ایکٹ مجریہ ۱۹۴۰ء کی رو سے وکلا کو پریکٹس کی اجازت دی گئی۸۳۔موجودہ دور میں اسی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے معمولی مقدمات میں فریقین کو وکیل کے بغیر پیش ہونے کی اجازت دینی چاہیے۔ ریاست میں نافذ العمل جدید نظامِ عدل کو عوام کے لیے سہل اور قابلِ قبول بنانے کے لیے اس میں حسبِ ضرورت اصلاحات کی جاتی رہیں۔ اس طرح ایسے غیرروایتی اور غیر روایتی قوانین جو عوام الناس کے جذبات سے ہم آہنگ نہ تھے انہیں ان کے لیے ممکنہ حد تک قابلِ قبول بنایا گیا۔ یہاں کے عوام ایک عرصہ سے فوری داد خواہی کے خوگر تھے ، چنانچہ اس مقصد کے لیے ججوں کے لیے یہ ضابطۂ کار وضع کیا گیا کہ وہ ایک سال کے دوران دائر ہونے والے تمام مقدمات کا تصفیہ ہرصورت میں سال کے آخر تک کردیں۸۴۔ عدلیہ کو اپنی سالانہ رپورٹ میں سال کے دوران درج شدہ ،فیصلہ شدہ اور غیر فیصلہ شدہ مقدمات کے اعداد وشمار دینے ہوتے تھے اس طرح عدالتِ عالیہ اپنی ماتحت عدالتوں کے فیصلوں کی جانچ پڑتال کرتی تھی اور کسی ضابطہ یا عدالتی طریقۂ کار کی خلاف ورزی کی صورت میں جواب طلبی کے

علاوہ ماتحت ججوں کی تنزلی اور برطرفی کے احکامات بھی صادر کیے جاتے تھے۸۵۔ یہی وہ اقدامات تھے جن کی وجہ سے عوام کا اس وقت کے مروجہ عدالتی نظام پر اعتماد بڑھا اور ان میں انصاف کے حصول کے لیے اپنا قانونی حق استعمال کرنے کا شعور پیدا ہوا۔ چنانچہ باہمی تنازعات کو بڑھانے کی بجائے اب انہیں عدالتوں کے ذریعے طے کرنے پر ترجیح دی جانے لگی۔ اس طرح ریاست کے سادہ لوح عوام میں انصاف کے حصول کے لیے اپنا قانونی حق استعمال کرنے کا شعور پیدا ہوا۔ غرض کہ نئے عدالتی نظام کی بدولت زراعت پیشہ طبقہ کو معاشی استحصال سے نجات ملی، تجارت پیشہ افراد، قرض دار اور مقروض افراد کو یکساں طور پر قانونی تحفظ حاصل ہوا۔ کیوں کہ نئی قانونی اصلاحات کے تحت اب دیوانی عدالتوں کو سودی لین دین کے تنازعات میں قابلِ عمل ضوابط کے تابع کر دیا گیا تھا۔ صدرِ عدالت اپنی معمول کی ذمہ داریوں کے علاوہ ''رفاہِ عامہ'' کے مقاصد اور ''امر باعث تکلیفِ عامہ'' جیسے واقعات کو رفع کرنے کے لیے انتظامیہ اور پولیس کو اپنے قلم بخ کے ذریعے احکامات صادر کرتی تھی۔ اس دور میں سرکاری ملازمین، ریاستی فوج اور انتظامیہ و عدلیہ کے عہدہ داران کی اپنے فرائضِ منصبی کی انجام دہی کے دوران روا رکھی جانے والی بے قاعدگیوں، بدعنوانیوں، رشوت ستانی اور عوام پر ظلم و زیادتی کے ارتکاب پر گرفت اور مواخذے کا اختیار عدالتِ عالیہ کو حاصل تھا۔ اگر تحقیق پر جرم ثابت ہو جاتا تو ملازمت سے برطرفی کے علاوہ قید اور جرمانے کی سزا بھی دی جاتی تھی۔ اس طرح انسانی حقوق کی خلاف ورزی یا پامالی کی صورت میں بھی عدلیہ از خود کارروائی کرتی تھی۔ خصوصاً ۱۸۷۱ء کے دوران ''غلامی کے انسداد'' اور ''عورتوں کی خرید و فروخت'' جیسے واقعات کے سدِ باب کے لیے عدالتِ عالیہ نے جو رولنگ دی وہ آئندہ کے لیے ریاست میں انسانی حقوق کے تحفظ کی ضامن ثابت ہوئی۸۶۔ ریاست بہاول پور کی عدلیہ نے بے شمار ایسے فیصلے کیے جنہیں عدالتی نظائر کی حیثیت حاصل ہے۔ ان میں سے ایک مثالی فیصلہ احمدیوں کو خارج از اسلام قرار دینے کا ہے۔ کیوں کہ اس مذہب کے پیروکار ختمِ نبوت کے قائل نہیں، اس لیے اسلام کے اس بنیادی عقیدہ سے انحراف کی بنیاد پر اس متنازعہ مسئلے کو عدالت میں زیرِ بحث لایا گیا۔ اس موقع پر برصغیر پاک و ہند کے تمام نامور مسلم علما کے علاوہ احمدی مذہب کے اہم علما کو بھی اپنے دلائل پیش کرنے کا پورا موقع دیا گیا۔ چھ سال کی طویل سماعت کے بعد بہاول پور کی عدلیہ نے خالصتاً حقائق و شواہد اور فریقین کے دلائل سننے کے بعد

احمدیوں کو مذہبِ اسلام سے خارج قرار دینے کا فیصلہ سنایا۔ واضح ہو کہ اس نوعیت کے مقدمات کے سلسلے میں پنجاب ، مدراس اور پٹنہ کی عدالتِ عالیہ احمدیوں کو مسلمانوں کا ہی ایک فرقہ قرار دے چکی تھیں، مگر یہ اعزاز صرف ریاست بہاول پور کی عدلیہ کو حاصل ہے کہ اس نے تمام اختلافی مسائل پر مکمل محاکمہ کے بعد برطانوی صوبہ جات کی عدالتوں کی نظائر کے مقابلہ میں ایک آفاقی نظیر پیش کی ۸۷۔ اسلام اور مرزائیت کے مابین ایک طویل مناقشہ جو برصغیر پاک وہند میں جڑ پکڑ چکا تھا کی حقیقت سے متعلق فقہی اجتہاد کو بروئے کار لا کر عدالتی فیصلہ سنایا گیا۔ کیوں کہ ریاست بہاول پور کی عدلیہ پاکستان کے علاقے میں شامل تھی اس لیے اگر قیامِ پاکستان کے فوراً بعد اس مذہبی مناقشے کا تدارک محض اسی فیصلے کی بنیاد پر طے شدہ تسلیم کر لیا جاتا اور فرقۂ احمدیہ کو خارج از اسلام مذہب قرار دے دیا جاتا تو پاکستان کے مسلمان نہ تو ۱۹۵۲-۵۳ء کے دوران اس کے لیے کوئی تحریک چلاتے اور نہ ہی حکومت کو اسے دبانے کے لیے پُر تشدد اقدامات کرنے پڑتے۔ بالآخر جب یہ دیرینہ مذہبی مسئلہ ۱۹۷۴ء میں دوبارہ ایک زبردست عوامی تحریک میں تبدیل ہو گیا تو خود پارلیمنٹ نے ختم نبوت کے بنیادی اُصول کو سامنے رکھتے ہوئے احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا۔

امیرانِ بہاول پور نے ذاتی طور پر بھی انصاف کی ترویج کو اپنا فریضہ بنایا۔ وہ عدلیہ کے بالا تر اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے عوام کی داد رسی کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے دربارِ عام کے ذریعے رعایا کی شکایات سننے اور ان کے ازالے کا طریقہ اختیار کیا۔ انہوں نے عوام کو انصاف ان کی دہلیز تک پہنچانے کے لیے ریاست کے طول و عرض میں دورے کیے اور عوامی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی۔ دارالحکومت میں یا اس سے باہر جب بھی وہ شاہی سواری کی صورت میں باہر نکلتے تو عوام کو اس موقع پر زبانی یا تحریری طور پر درخواستیں پیش کرنے کی اجازت تھی ۸۸۔اس کے علاوہ دو آخری نوابوں کے دور میں اس مقصد کے لیے شاہی دروازے کے ساتھ ایک صندوق رکھا گیا۔ عوام کو اپنی عرضیاں بذریعہ ڈاک بھیجنے کی سہولت بھی دی گئی۔ عموماً یہ درخواستیں یا شکایات سرکاری عہدہ داران اور عمالِ ریاست کی بدعنوانی، رشوت ستانی اور ظلم و جور سے متعلق ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ لوگ اپنے علاقے کے جاگیرداروں یا زمینداروں کی زیادتیوں اور بداعمالیوں سے متعلق بھی دادرسی حاصل کرتے تھے۔ علاوہ ازیں ایسے مواقع پر سادہ لوح دیہی آبادی اپنے خاندانی تنازعات اور مناقشات بھی پیش

کرنے میں کوئی عار محسوس نہ کرتی تھی۔ جب کہ ضرورت مند افراد اسی ذریعے سے اپنی ذاتی اغراض اور معاشی حاجات پیش کرتے تھے۔ امیرانِ بہاول پور عوامی شکایات کا ہر ممکنہ طریقے سے سدِ باب کرتے اور لوگوں کی حاجت روائی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھتے۔ نواب صادق محمد خاں رابع نے سرکاری افسران و اہلکاران کی چیرہ دستیوں سے اپنی رعایا کو محفوظ کرنے کے لیے ۱۸۸۱ء میں جو ضابطہ وضع کیا اس کے مطابق اُنہیں عوام سے زبردستی اشیائے صرف حاصل کرنے یا بے جا طور پر کسی کے ہاں قیام کرنے کی سختی سے ممانعت کردی۔ اس طرح نواب محمد بہاول خاں خامس نے ۹ نومبر ۱۹۰۴ء کو اپنے خصوصی فرمان کے ذریعے تمام افسران کو اپنے ماتحتوں اور رعایا سے تحائف اور ڈالیاں وصول کرنے کی ممانعت کر دی[۸۹]۔ یہ ضابطہ دفتری نظام میں رشوت ستانی اور بدعنوانی کے خاتمے کی طرف ایک مثبت پیش رفت تھا۔ آخری نواب صادق محمد خاں خامس نے ۱۹۳۰ء میں سرکاری ملازمین اور ان کے اہلِ خانہ کو کسی بھی شخص سے انعام، عطیہ یا معاوضہ وصول کرنے کی ممانعت کر دی[۹۰]، غرضِ کہ ریاست بہاول پور نے اپنے عوام کو انصاف فراہم کرنے کے لیے ایک مربوط عدالتی ڈھانچہ تشکیل دیا اور اپنی آبادی کے تمام طبقات کو معاشی اور معاشرتی انصاف کے مواقع فراہم کرتے ہوئے ایک فلاحی ریاست کا تصور پیش کیا جس کی آج کے دور میں بھی بے حد ضرورت ہے۔

ریاست میں امن و امان کے قیام اور جرائم کے روک تھام کے لیے پولیس کے مؤثر نظام کی ضرورت تھی۔ چنانچہ جنوری ۱۸۶۷ء سے سابقہ دور کے کوتوالوں کی نگرانی میں فوج کے ''خود اسپہ'' سپاہیوں پر مشتمل پولیس فورس کا قیام عمل میں آیا[۹۱]۔ ریاست میں پولیس نظام کے عمیق جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۹۹ء تک کوئی منضبط پولیس کوڈ رائج نہ تھا، تاہم اسی سال'' پنجاب پولیس کوڈ'' کو متعارف کرایا گیا۔ البتہ اسے یہاں کے مخصوص حالات سے مربوط کرنے کے لیے اس میں کچھ ترمیمات کی گئیں اور بعض نئے ضوابط شامل کیے گئے[۹۲]۔ اس سے نہ صرف قابلِ دست اندازی پولیس اور ناقابلِ دست اندازی پولیس معاملات میں تخصیص پیدا ہوئی بلکہ پولیس کو اپنی حدود و قیود کا علم ہوا۔ ۱۹۰۵ء کی پولیس اصلاحات کے نفاذ سے ریاستی پولیس کو برطانوی ہند کی پولیس کی طرز پر منظم کیا گیا۔ کیوں کہ تمام پولیس کو ایک مرکز سے نگرانی کرنے کی ضرورت تھی، چنانچہ اس مقصد کے لیے دارالحکومت میں سپرنٹنڈنٹ پولیس کا دفتر قائم کیا گیا[۹۳]۔ علاوہ ازیں پولیس لائن کے قیام سے پولیس

کی پیشہ ورانہ تربیت کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ تاہم شرح خواندگی میں کمی کی وجہ سے خاطر خواہ طور پر تربیت کے مقاصد پورے نہ ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ اس اہم محکمے کو عوام دوست ادارے میں تبدیل کرنے کے لیے اس کی اخلاقی تربیت کے تقاضے بھی پورے نہ کیے گئے۔ کم از کم ایک اسلامی ریاست کی پولیس کو اسلام کی ہمہ گیر تعلیمات کے ذریعے رشوت، بدعنوانی، بدکلامی، درشتگی اور اپنے اختیارات سے متجاوز ہونے سے روکا جا سکتا تھا۔ تربیت کا یہی فقدان برطانوی ہند کی پولیس کا خاصا تھا، مگر موجودہ دور میں ان ناپسندیدہ روایات و اثرات سے چھٹکارا حاصل کرنا ہمارے قومی مقاصد میں شامل ہونا چاہیے۔علاوہ ازیں ریاست میں جرائم کی بیخ کنی کے لیے''جرائم پیشہ اقوام کے ایکٹ'' کے نام سے جو قانون نافذ کیا گیا[۹۴]، اس کا بڑا مقصد نہ صرف ایسے جرائم پیشہ گروہوں پر نظر رکھنا تھا جو کسی ایک خاندان یا قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے بلکہ انہیں مستقل طور پر جرائم کی دنیا سے نکال کر کسی صحت مند فن یا پیشہ سے منسلک کرنا، ان کے بچوں کی تعلیم کا انتظام کرنا اور ایسے افراد کی بہبود و بحالی کے لیے حکومتی سطح پر اہتمام کرنا جیسے مقاصد شامل تھے۔ یہ وہ اقدامات تھے جنہیں بروئے کار لا کر جرائم سے وابستہ افراد اور خاندانوں کو مستقل طور پر ایک با مقصد زندگی کی طرف لانے کی کوشش کی گئی۔ موجودہ دور میں بے شمار افراد بے روزگاری کے ہاتھوں مجبور ہوکر جرائم کو بطور پیشہ اختیار کر چکے ہیں۔ ان میں تعلیم یافتہ افراد کی اکثریت ہے۔ موجودہ دور میں سرکاری سطح پر یا این۔جی۔اوز (غیر سرکاری ادارے) کی طرف سے جرائم پیشہ افراد سے متعلق ایسی منصوبہ بندی کی جا سکتی ہے، جس کی مدد سے انہیں با عزت روزگار کے مواقع فراہم کرنے کی ضمانت پر اپنی مجرمانہ سرگرمیوں سے کنارہ کش ہونے کے مواقع میسر آسکیں۔ یہی وہ طریقہ ہے جو کسی پولیس کی مدد کے بغیر جرائم میں ملوث افراد کو راہِ راست پر لانے اور معاشرے سے جرائم کے بڑھتے ہوئے رجحانات کے استیصال میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

ریاست میں جیلوں کے نظامِ کار اور قیدیوں کی حالت زار کو بہتر بنانے کے لیے متعدد اصلاحی اقدامات کیے گئے۔ اسی نقطۂ نظر سے ۱۸۶۶ء میں اس محکمے کا چارج کسی درشت جیلر کے ہاتھ میں دینے کی بجائے ریاست کے چیف میڈیکل آفیسر کے سپرد کیا گیا[۹۵]۔ اسی طرح ۱۸۷۰ء میں دیگر مقامات کی جیلوں کی بندش اور وہاں پر مقید قیدیوں کی سنٹرل جیل بہاول پور منتقلی کا مقصد بھی یہی تھا کہ سزایابی کے عمل کو انسانی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے منضبط بنانے میں معاونت مل سکے۔ اس کے علاوہ

قیدیوں سے لی جانے والی مشقت کو منفعت بخش بنانے کے لیے جیل کو ایک صنعتی یونٹ میں تبدیل کیا گیا۔ بہاول پور سینٹرل جیل اس لحاظ سے ایک مثالی ادارہ تھا کہ یہاں مقامی فنون اور گھریلو صنعت کو فروغ ملا۹۶۔ یہاں پر تیار کی جانے والی اشیائے صرف کی مقامی منڈی میں کھپت تھی جب کہ فرنیچر اور کاغذ وغیرہ دفاتر میں استعمال کیا جاتا تھا۔اس سے حاصل شدہ آمدنی جیل کے نصف سے لے کر دو تہائی اخراجات تک کی کفالت کرتی تھی۔ اس کا دوسرا تابناک پہلو یہ تھا کہ اس طریقے سے ہر قیدی اس قدر ہنر مند بنا دیا جاتا تھا کہ وہ رہا ہونے کے بعد کسی بھی صنعتی پیشہ کے ذریعے روزگار حاصل کر سکتا تھا۔

شہری علاقوں کے انتظام و انصرام میں بلدیاتی اداروں کی اہمیت کے پیشِ نظر ریاست بہاول پور نے۱۸۶۷ء میں ان کی تشکیل کی ضرورت محسوس کی۹۷۔ یقیناً یہ ایک ایسا مثبت قدم تھا جس کی طرف اس وقت تک حیدرآباد دکن جیسی اہم ریاست کے علاوہ بیشتر ہندوستانی ریاستوں نے کوئی پیش رفت نہیں کی تھی۔۱۸۷۴ء کے ''بہاول پور میونسپل لاز'' کی رُو سے شہروں میں ٹریفک کے قوانین پر عمل درآمد ، وبائی امراض کی روک تھام ، منافع خوری کے تدراک اور ملاوٹ شدہ کھانے پینے کی اشیا کی فروخت کی روک تھام، گداگری کی ممانعت اور خطرناک جانوروں کے رکھنے پر پابندی جیسے اُمور کی خلاف ورزی پر جرمانہ اور قید کی سزا دینے کا اختیار بھی اراکین کمیٹی کو تفویض کیا گیا۹۸۔ یہی وہ سلگتے ہوئے مسائل ہیں جو آج بھی شہری علاقوں اور ان کے عوام کو درپیش ہیں، جنہیں حل کرنے کا زیادہ سے زیادہ اختیار حکومتِ خود اختیاری کے ارکان کو حاصل ہونا چاہیے۔ ریاست کے بلدیاتی نظام کو اس اعتبار سے بھی ترقی یافتہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ بتدریج بڑھتی ہوئی آبادی کے تقاضوں اور مستقبل کی ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے شہروں کی توسیع اور ان میں تعمیراتی منصوبوں کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔ اس کی پیش رفت کے طور پر۱۸۷۴ء میں بہاول پور کے قدیم شہر کی تعمیرِ نو کا آغاز باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ عمل میں آیا۹۹۔ چنانچہ آمدورفت کی سہولت کے لیے شہر کو سرکلر روڈ سے محیط کیا گیا۔ اندرونِ شہر گلیوں اور راستوں کے پیچ وخم درست کیے گئے۔ کاروباری مقاصد کے لیے آٹھ بازار قائم ہوئے۔ ان میں بیشتر دوکانیں باقاعدہ نقشہ کے مطابق میونسپلٹی کی طرف سے تیار کر کے فروخت کی گئیں۔ حفاظتی نقطۂ نظر سے شہر کے داخلی راستوں پر متعدد دروازے تعمیر کیے گئے، مسافروں کے قیام

کے لیے سراؤں کی سہولت مہیا کی گئی۔ پانی کی فراہمی کے لیے پختہ کنوویں اور تالاب بنائے گئے۔ شہر کے چاروں طرف ایک نہر رواں دواں تھی جو اسے سیراب کرتی تھی، جب کہ اس کے کناروں پر مہیا کردہ گھاٹ عوامی غسل خانوں کی ضروریات پورا کرتے تھے۔ اگرچہ اس دور کے شہریوں کو فضائی آلودگی کا سامنا نہیں تھا، تاہم انہیں ترو تازہ ہوا کی فراہمی کے لیے شہر کے اطراف میں بائیس کے لگ بھگ باغات لگوائے گئے، اس کے دروازوں کو اضافی طور پر باغیچوں سے مزین کیا گیا اور سڑکوں کو شجر کاری کے ذریعے سایہ دار بنایا گیا۔ علاوہ ازیں سٹریٹ لائٹ تک کا انتظام کیا گیا۔ غرض کہ ٹاؤن پلاننگ کے انہی مُسلّمہ اُصولوں کو ریاست کے دیگر شہروں کی توسیع وتعمیر کے دوران بھی اختیار کیا گیا۔۱۹۰۳ء میں جدید واٹر سپلائی سکیم کا اجرا اور۱۹۱۰ء سے سیوریج کے قابلِ عمل منصوبے کا آغاز اس دور کے بلدیاتی نظام کی بہتر کارکردگی کی دلیل ہیں[۱۰۰]۔ اس طرح۱۹۴۲-۴۳ء کے دوران ریاست کے اہم شہروں کی توسیع کے لیے جو ''ٹاؤن پلاننگ سکیم'' تیار کی گئی تھی۔ اس میں اس دور کے مروجہ بین الاقوامی اُصول وضوابط کو ملحوظ رکھا گیا تھا[۱۰۱]۔ واضح ہو کہ شہروں کی توسیع کے اس منصوبے کو آئندہ صدی تک کی ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر مربوط کیا گیا، جسے اس دور کے شہری منصوبہ بندی کے ماہرین اور پبلک ورکس کے انجینئروں نے باہمی شراکت سے تیار کیا تھا۔ اس ٹاؤن پلاننگ سکیم کی خاص خوبی یہ تھی کہ اس میں خصوصیت سے ہر طبقہ کے لوگوں کے لیے جدید رہائشی سکیمیں تیار کی گئی تھیں۔ علاوہ ازیں تعلیمی ، صنعتی، دفتری ، کاروباری اور رہائشی زون علیحدہ علیحدہ مختص کیے گئے تھے۔ ابھی ریاست میں اس جدید ٹاؤن پلاننگ سکیم کے معدودے چند حصوں پر عمل درآمد ہی ہوا تھا کہ وحدتِ مغربی پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے نتیجے میں بہاول پور کی جداگانہ حیثیت ختم ہوئی۔ چنانچہ ارتکازِ اختیار کے نتیجے میں بلدیاتی تعمیر و ترقی کے تمام منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔وسائل کا منبع بدل جانے سے شاہراہِ ترقی کا رُخ بھی تبدیل ہو گیا۔

ایک اور اہم شعبہ جس نے خصوصیت سے عوام میں شعور و آگہی کے نفوذ میں بھر پور کردار ادا کیا، وہ سرکاری چھاپہ خانہ تھا۔ واقعتاً اس کے قیام۱۸۶۷ء سے ریاست بہاول پور نے ذرائع ابلاغ کے ایک ایسے دور میں قدم رکھا جس سے اس وقت تک مقامی ریاستیں اور برطانوی ہند کے متعدد صوبے تہی دست تھے[۱۰۲]۔ واضح ہو کہ اردو زبان جسے باقاعدہ طور پر۱۸۶۶ء سے ریاست کی واحد

سرکاری زبان ہونے کا اعزاز حاصل ہوا، کی ترویج و اشاعت میں اس پریس کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس مطبع کی بدولت ریاستی قوانین و ضوابط اور سرکاری احکامات کو اردو زبان میں منضبط کرنے کا آغاز ہوا، جنہیں ''صادق الاخبار گزٹ'' میں باقاعدگی سے مشتہر کیا جاتا تھا۔ یہی وہ ذرائع تھے، جن کی بدولت اردو نے ریاست میں مسلسل اٹھاسی برسوں (۱۸۶۶ء تا ۱۹۵۴ء) تک اپنا سکہ بٹھائے رکھا۔ اس طویل عرصے کے دوران سرکاری زبان کی حیثیت سے اردو نے تمام ارتقائی منازل طے کیں۔ علاوہ ازیں دفتری، مالیاتی اور عدالتی اصطلاحات کی بھرپور شمولیت نے خود کو بارآور بنایا اور اس کے نتیجے میں ایک کاملاً قابلِ نفاذ زبان کا درجہ حاصل کیا۔

جہاں تک امیرانِ بہاول پور کے دفاعی نظام کا تعلق ہے تو انہوں نے ابتدائی ایک سو گیارہ سالوں کے دوران اپنی مرکزی اور باقاعدہ فوج کی مدد سے اندرونی اور بیرونی محاذوں پر کئی شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔ ۱۸۳۸ء کے اینگلو بہاول پور معاہدہ کی رُو سے ریاست کے دفاع کی تمام تر ذمہ داری برطانوی حکومت کے سپرد تھی[۱۰۳]۔ اس کے بعد سے ریاستی فوج صرف اندرونی نظم و نسق کے قیام اور امیرانِ بہاول پور کی حفاظت کے فرائض انجام دیتی تھی۔ اگرچہ کسی بھی معاہدہ کی رُو سے ریاست کو امدادی فوج رکھنے کا پابند نہیں کیا گیا تھا، مگر طلب کرنے پر اسے ہر صورت میں انگریزی حکومت کو عسکری معاونت فراہم کرنا ہوتی تھی۔ چنانچہ انگریزی مفادات کے تحفظ کے لیے نگران حکومت نے دوسرا بڑا مقصد ۱۸۶۹ء میں ''رسالۂ نظام'' کے نام سے امدادی فوج تشکیل دی[۱۰۴]۔ جو آئندہ اٹھہتر برسوں تک برطانوی استعمار کے آلۂ کار کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ ایک ایسی فوج جس کا ریاست کے دفاع سے تو کوئی تعلق نہ تھا البتہ اس پر اٹھنے والے اخراجات ریاستی معیشت کے لیے گراں بوجھ کا درجہ رکھتے تھے۔ ۱۸۸۸ء سے ۱۹۰۰ء کے دوران دربارِ بہاول پور کو ''امپیریل سروس ٹروپس'' کے قیام پر سالانہ لاکھوں روپے خرچ کرنے پڑے۔ اس فوج نے دوسری جنگ عظیم کے دوران مشرقی محاذ پر نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ تاہم سقوطِ سنگاپور کے نتیجے میں ''دی بہاول پور فرسٹ انفنٹری'' کو شدید نقصان پہنچا۔ مگر نواب صادق محمد خاں خامس، جو خود برطانوی فوج کے تربیت یافتہ افسر تھے، نے اس فوج کی تشکیل نو میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مگر اس کے نتیجے میں ریاست کا دفاعی بجٹ ۱۹۴۶ء میں چوبیس لاکھ چونسٹھ ہزار بیانوے روپے تک جا پہنچا[۱۰۵]۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد ۱۹۵۲ء کے ضمنی معاہدہ

الحاق کے مطابق ریاست بہاول پور کی جدید انداز میں تربیت یافتہ ایک ڈویژن کے قریب فوج پاکستانی فوج میں ضم ہونے کے بعد بلوچ رجمنٹ قرار پائی اور دفاع پاکستان میں معاون ثابت ہوئی۱۰۶۔ جس کا نشان حسب سابق حواصل(Pelican)برقرار رکھا گیا۔ یہی فوج اب ایک کور (Corp) کا درجہ رکھتی ہے۔

جہاں تک ریاست بہاول پور کے خارجہ اُمور کا تعلق ہے تو۱۸۳۸ء کے اینگلو بہاول پور معاہدہ کی رو سے اس کی بین الاقوامی حیثیت ختم ہو چکی تھی۔ اسی معاہدہ کے تحت ایک طرف تو بالا دست انگریزی حکومت نے اپنی ''ماتحت علیحدگی کی پالیسی'' '' The Policy of Subordinate Isolation'' کے اطلاق سے ریاست کو خارجہ تعلقات کے سلسلے میں دیگر ریاستوں سے الگ تھلگ کر کے اسے محض اپنا زیرنگیں بنا لیا، جب کہ دوسری جانب دربارِ بہاول پور کو اپنی ''ماتحت اتحاد کی پالیسی'' (The Policy of Subordinate Union) کے ذریعے پابند کیا گیا کہ وہ اس اتحاد کی قیمت چکانے کے لیے انگریزی استعمار کو ہر ممکنہ امدادو تعاون فراہم کرے۱۰۷۔اگرچہ اس کے بعد سے ریاست کے خارجہ تعلقات کا محور و مرکز ہندوستان کی برطانوی حکومت تھی ۔ تاہم امیرانِ بہاولپور کو دیگر مقامی ریاستوں کے حکمرانوں سے صرف نجی اور دوستانہ مراسم کی حد تک تعلقات اُستوار کرنے کی اجازت تھی۔ چنانچہ ان دونوں مقاصد کے لیے خارجہ اُمور کا شعبہ تو قائم رہا مگر اس کے لیے کسی قسم کی خارجہ پالیسی کی ضرورت نہ تھی۔

غرضِ کہ اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ریاست بہاول پور کا انتظامی ڈھانچہ اپنے عہد کی بیشتر ہندوستانی ریاستوں کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کے حکومتی نظام کو بہتر بنانے کے لیے نہ صرف برطانوی ہند کے انتظامی اداروں کی ساخت سے بھرپور استفادہ کیا گیا تھا بلکہ اس کے عملی نفاذ میں انگریزوں نے معاونت فراہم کی تھی۔ البتہ نظم ونسق مملکت کو مقامی روایات سے ہم آہنگ کرنے میں خود امیرانِ بہاولپور نے بھرپور کردار ادا کیا۔ اگرچہ ریاستی عوام جمہوری آزادیوں سے یکسر محروم تھے، تاہم اُنہیں ہر قسم کے معاشی، معاشرتی اور شہری حقوق حاصل تھے۔ یہی وہ دور تھا جب کہ ریاستی وسائل کو ممکنہ حد تک شہریوں کی فلاح و بہبود پر صرف کرنے کا آغاز ہوا۔ تعلیم اور صحت جیسی بنیادی سہولیات کی بلاتخصیص و بلا معاوضہ فراہمی ممکن ہوئی ۔

امنِ عامہ کے قیام سے عوام کے جان و مال کو تحفظ حاصل ہوا اور انصاف کی ترویج کو ریاست کا بنیادی فریضہ قرار دیا گیا۔ بادیٔ النظر میں یہی وہ عوامل ہیں جو کسی ریاست کو فلاحی مملکت کے تصور سے قریب تر کرنے میں ممد معاون ثابت ہوتے ہیں۔ یہاں پر ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ریاست بہاول پور نے اپنے عوام کو ان مقاصد سے ہمکنار کرنے کے لیے ہر ممکنہ سعی کی۔ موجودہ دور میں اسلامی جمہوری مملکتِ پاکستان کے انتظامی اداروں کو زیادہ سے زیادہ عوامی خواہشات سے ہم آہنگ کرنے کی جو ضرورت محسوس کی جا رہی ہے، تو اس سلسلے میں سابق ریاست بہاول پور کے گراں قدر انتظامی تجربات سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں جب کبھی پاکستان کو مزید انتظامی اکائیوں میں منقسم کیا جائے ، جس کی ضرورت کا احساس موجودہ دور میں بڑی شدت سے ہو رہا ہے، تو ایسی صورت میں سابق ریاست بہاول پور کے علیحدہ انتظامی یونٹ کو اپنی سابقہ جغرافیائی حدود میں بحال کرنے کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ وحدتِ مغربی پاکستان سے قبل ایک جداگانہ صوبے کے طور پر اس کی حیثیت متعین تھی۔ کیوں کہ یہی وہ حکمت عملی ہے جس کے ذریعے پاکستان کے اس پس ماندہ خطے کے عوام زیادہ سے زیادہ معاشی و اقتصادی خوش حالی سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

حوالہ جات

۱- ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں کے لیے توپوں کی سلامی کو ایک ذاتی اعزاز تصور کیا جاتا تھا۔ سلامی کی آخری حد اکیس توپیں تھیں جب کہ گیارہ توپوں کی سلامی کے مجاز حکمرانوں کو"His Higness" کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ دیکھیے:

Lefel H. Griffin, *The History of the Principal States of the Punjab and their Political Relations with the British Government*, Lahore, 1976, p. 372.

2. Sheikh Salahauddin, *Bahawalpur Speaks*, Lahore, 1970, p.3.
3. Muhammad Din, *A Political History of Bahawalpur State 1833-66*, (M.S), Bahawalpur, 1930, pp. 10-11.

۴- مولوی محمد اعظم، جواہرِ عباسیہ (فارسی مخطوطہ)، قلعۂ دراوڑ، ۱۸۳۹ء، ص ۶۷۔

۵- مراد شاہ گردیزی، تاریخ مراد، جلد پنجم، (اردو مخطوطہ)، بہاول پور، ۱۸۷۵ء، ص ۲۹۔

6. Nazeer Ali Shah, *Sadiq Nomah*, Lahore, 1960, p. 65.

7. The Bahawalpur Government, *The Administration Report of Bahawalpur State 1899-1900,* Bahawalpur, 1900, p.97.

۸- نواب مذکورہ کو وائسرائے لارڈ کرزن (۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۵ء) نے ۱۲نومبر ۱۹۰۳ء کو بہاول پور کے نورمحل دربار میں اختیارات تفویض کیے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے

The Chamber of Princes, *The British Crown and the Indian States, Calcutta, 1930,* p. 67.

۹- پنجاب میں سب سے پہلے مہاراجہ دلیپ سنگھ (۱۸۴۳ء تا ۱۸۴۹ء) کی کم سنی کے دوران اس کی والدہ کو ریجنٹ مقرر کیا گیا تھا۔ دیکھیے:

Syed Muhammad Latif, *History of the Punjab,* Calcutta, 1891, p.339.

۱۰- نواب صادق محمد خاں خامس کو وائسرائے لارڈ ریڈنگ نے ۸مارچ ۱۹۲۴ء کو اختیارات تفویض کیے۔ دیکھیے: مامون الرشید عباسی، *صادق دوست*، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص۳۰۔

۱۱- انٹرویو، کرنل معتصم باللہ عباسی، ۹جون ۱۹۹۰ء۔

12. The Bahawalpur Archives, *Instrument of Accession of Bahawalpur State,* 3 October 1947.

۱۳- سید نذیر علی شاہ، *صادق نامہ*، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص۹۴۔

۱۴- ریاست بہاول پور کی پرانی انتظامی اکائیاں دیہات، پتی، موضع، حلقہ، تعلقہ، پیش کاری، کارداری اور نظامت کے نام سے موجود تھیں۔ دیکھیے

The Government of Punjab, *The Gazetteer of Bahawalpur State 1904,* Lahore, 1906, p. 283.

۱۵- میر ناصر علی، *جغرافیہ ریاست بہاول پور*، دہلی، ۱۸۹۲ء، ص۲۲۔

16. The Government of Bahawalpur, *The Administration Report of Bahawalpur State 1866-67,* Bahawalpur, 1867, p.2.

۱۷- جانشینی کے اس اصول کے تحت ۱۸۶۶ء میں نواب صادق محمد خاں رابع، ۱۸۹۹ء میں نواب محمد بہاول خاں خامس اور ۱۹۰۷ء میں نواب صادق محمد خاں خامس کی مسند نشینی ہوئی۔

۱۸- پرندہ حواصل (Pellican) کی سرشت سے متعلق دیکھیے:

Oliver L. Austin, *Birds of the World,* Italy, 1983, pp. 40-41.

۱۹- عزیز الرحمٰن، *حیات محمد بہاول خاں خامس*، بہاول پور، ۱۹۳۹ء، ص۱۱۲۔

۲۰- اسے مودی خانہ یا Commissariat Department بھی کہا جاتا تھا۔ دیکھیے:

The Administration Report of Bahawalpur 1869-70,

Bahawalpur, 1870, p. 4.

۲۱- ریاست کی طرف سے تعلیمی اداروں کو دی جانے والی امدادوں کی تفصیل کے لیے دیکھیے: مولوی محمد دین، میونسپل گزٹ لاہور کا صادق نمبر، لاہور، ۱۹۳۰ء، ص ص ۵۵-۵۶۔

۲۲- صاحبزادہ قمر الزمان عباسی، بغداد سے بہاول پور، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۲۳۱۔

۲۳- ان کھانوں کا تذکرہ چارلس میسن نے کیا ہے۔ دیکھیے:
Charles Masson, *Narrative of Various Journeys in Bolochistan and the Punjab*, Karachi, 1974, pp. 15-16.

24. *The Administration Report of Bahawalpur State 1907-08*, Bahawalpur, 1908,p.5.

۲۵- عزیز الرحمٰن، صبیح صادق، بہاول پور، ۱۹۰۰ء، ص ۱۳۵۔

۲۶- ایضاً، ماہ نامہ العزیز، ستمبر ۱۹۴۰ء، ص ۲۸۔

۲۷- حکومت بہاول پور، صادق الاخبار گزٹ، ہفت روزہ، بہاول پور، ۱۳ مارچ ۱۸۷۱ء، ص ۵۔

۲۸- محمد بہاول خاں خامس، انتظام جدید ریاست بہاول پور، بہاول پور، ۱۹۰۵ء، ص ۱۷۔

۲۹- صادق الاخبار گزٹ، ۶ مئی ۱۸۷۳ء، ص ۲۱۸۔

۳۰- ریاست بہاول پور نے "ستلج ویلی پراجیکٹ" کے قرض کی ادائیگی سال ۱۹۸۶ء تک کرنا تھی۔ مگر اسے سال ۱۹۵۰ء میں ادا کر دیا گیا۔ دیکھیے: حکومتِ بہاول پور، میزانیہ برائے سال ۱۹۵۰ء-۱۹۵۱ء، ص ۱۔

۳۱- فوجیوں کو الاٹ شدہ رقبہ جات کی اصل قیمت کا صرف ایک چوتھائی وصول کیا جاتا تھا، جس کی ادائیگی آسان اقساط میں ہوتی تھی۔ دیکھیے:
The West Pakistan Government, *The Bahawalpur Manual 1968*, Bahawalpur, p. 41.

32. The West Pakistan Government, *The Bahawalpur Code 1967*, Bahawalpur, p. 5.

۳۳- اس مقصد کے لیے ۱۸۹۴ء، ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۸ء میں "قواعد سود درسود" اور "The Agriculturists Debtors Relief Act" جیسے قوانین وضع کیے گئے۔ دیکھیے: مولوی منظور حسن، مجموعۂ قوانین ریاست بہاول پور (قوانین منظور)، بہاول پور، ۱۹۳۲ء، ص ص ۳۴-۳۵۔

۳۴- مجموعہ قوانین ریاست بہاول پور، ص ۲۵۵۔

35. *The Administration Report of Bahawalpur State 1943-44*,

Bahawalpur, 1944, p.31.

36. *The Administration Report of Bahawalpur State 1942-43*, Bahawalpur, 1943, p.29.

۳۷- صادق الاخبار گزٹ، ۲۶ جون ۱۸۷۱ء، ص ۳۔

38. *The Administration Report of Bahawalpur State 1942-43*, Bahawalpur, 1943, p.5.

39. *The Bahawalpur Information Department, The Bahawalpur Review, July-August 1954*, p. 11.

40. *A Political History of Bahawalpur State 1833-66*, p. 7.

41. *The Administration Report of Bahawalpur State 1867-68*, Bahawalpur, 1868, p.6.

42. *The Administration Report of Bahawalpur State 1874-75*, Bahawalpur, 1875, p.105.

۴۳- صادق الاخبار گزٹ، ۳۱ جولائی ۱۸۷۱ء، ص ۱۰۔

44. *The Administration Report of Bahawalpur State 1870-71*, Bahawalpur, 1868, p.6.

۴۵- صادق الاخبار گزٹ، ۲۵ ستمبر ۱۸۷۱ء، ص ۳۔

۴۶- یہ ادارہ گورنر پنجاب رابرٹ ایجرٹن اور نواب صادق محمد خاں رابع کے ناموں کے اشتراک سے قائم ہوا۔ دیکھیے: صبح صادق، ص ۱۱۸۔

۴۷- صادق الاخبار گزٹ، ۱۲/ اکتوبر ۱۸۸۴ء، ص ۵۔

48. *The Administration Report of Bahawalpur State 1913-14*, Bahawalpur, 1914, p.30.

۴۹- صادق الاخبار گزٹ، ۱۰/ اکتوبر ۱۸۸۲ء، ص ۵۔

۵۰- ایضاً، ۲۴ مئی ۱۹۲۸ء، ص ۲۔

۵۱- جامعہ میں ''علامہ'' کی جماعت کے اجرا کی منظوری ۱۳ جولائی ۱۹۵۲ء کو سید سلیمان ندوی کی صدارت میں منعقدہ اجلاس کراچی میں دی گئی۔ دیکھیے: گورنمنٹ گزٹ بہاول پور، ۱۷ جولائی ۱۹۵۲ء، ص ۵۔

۵۲- صادق الاخبار گزٹ، ۲۵ ستمبر ۱۸۸۴ء، ص ۷۔

53. *The Administration Report of Bahawalpur State 1906-07*, Bahawalpur, 1907, p.28.

54. Mehr Din, *The Annual Administration Report of Education Department of Bahawalpur State 1915-16*, p. 2.

55. *The Administration Report of Bahawalpur State 1942-43*, Bahawalpur, 1943, p.2.
56. *The Administration Report of Bahawalpur State 1945-46*, Bahawalpur, 1946, p.114.

۵۷- گورنمنٹ ایس۔ای کالج، بہاول پور، نخلستان ادب، سالانہ مجلہ، بہار نمبر ۱۹۴۷ء، ص ص ۱۳-۱۶۔

58. *The Administration Report of Bahawalpur State 1944-45*, Bahawalpur, 1945, p.110.
59. *The Administration Report of Bahawalpur State 1943-44*, Bahawalpur, 1943, p.104.
60. *The Administration Report of Bahawalpur State 1942-43*, p.93.
61. *The Bahawalpur Review*, April 1954, p. 44.
62. *The Bahawalpur Review*, Feb-March 1954, p. 37.
63. *The Administration Report of Bahawalpur State 1945-46*, p.113
64. *The Administration Report of Bahawalpur State 1949-50*, p.45.
65. Dr. Muhammad Din, *Report on the Medical Department of Bahawalpur State, 1899*, p.4.

۶۶- صادق الاخبار گزٹ، ۶ دسمبر ۱۹۴۵ء، ص ۴۔

67. *Report on the Medical Department of Bahawalpur State, 1899*, pp. 4-5.
68. *The Administration Report of Bahawalpur State 1870-71*, p.24.

۶۹- صادق الاخبار گزٹ، ۲۷ مئی ۱۸۷۲ء، ص ۳۷۴۔

70. *The Administration Report of Bahawalpur State 1944-45*, p.96.

۷۱- بہاول وکٹوریہ ہسپتال کے انچارج عمر بخش نے اس سلسلے میں یہ اشتہار شائع کرایا کہ "جو لوگ ان سے علاج کرانا چاہتے ہیں وہ ان کے مکان واقع بہاول وکٹوریہ ہسپتال میں آکر مفت علاج کرائیں۔ غریب، مفلس اور پردہ دار مستورات جو وہاں نہ آسکیں وہ مجھے گھر پر بلا کر علاج مفت کرا سکتے ہیں۔ دیکھیے: صادق الاخبار گزٹ، ۱۲ مارچ ۱۹۰۸ء، ص ۲۔

72. *The Bahawalpur Government, Extracts From the Punjab Reports 1857-71*, Bahawalpur, 1871, p. 4.

۷۳- صادق الاخبار گزٹ، ۲۰ مارچ ۱۸۷۱ء، ص ۴۔

۷۴- ایضاً، (خصوصی اشاعت) ۱۶ ستمبر ۱۹۳۷ء، ص ص ۲-۱۔

۷۵- انتظام جدید ریاست بہاول پور ۱۹۰۵ء، ص ۶۔

۷۶- حکومت بہاول پور، بہاول پور پنچائیت ایکٹ ۱۹۴۳ء، بہاول پور ۱۹۴۳ء، ص ۱۴۔

۷۷- صبح صادق، ص ۱۵۱۔

78. *The Administration Report of Bahawalpur State 1900-01*, p.3.

۷۹- ایضاً، ص ۱۵۱۔

۸۰- دفتر دستاویزات بہاول پور، فائل کارروائی جوڈیشل کمیٹی ۱۹۴۷ء، ص ص ۹-۱۰۔

۸۱- حکومتِ بہاول پور، قواعد اسٹامپ ریاست بہاول پور مجریہ ۱۸۷۱ء، بہاول پور ۱۸۷۱ء، ص ص ۱-۴۔

82. *The Administration Report of Bahawalpur State 1874-75*, p.72.

۸۳- صادق الاخبار گزٹ، ۵ ستمبر ۱۹۷۴ء، ص ۵۔

84. *The Administration Report of Bahawalpur State 1868-69*, p.9.

85. *The Administration Report of Bahawalpur State 1874-75*, p.72.

۸۶- یہ رولنگ مسمات پارچی کو بیکانیر سے نوشہرہ (رحیم یار خاں) میں لا کر فروخت کرنے کے مقدمے کے سلسلے میں دی گئی۔ دیکھیے: صادق الاخبار گزٹ، ۱۳ نومبر ۱۸۷۱ء، ص ۳۔

۸۷- اس مقدمے کی تفصیل کے لیے درج ذیل کتب دیکھیے:

i- مولانا غلام محمد گھوٹوی، فیصلہ مقدمہ بہاول پور، امرتسر، ۱۹۳۵ء۔

ii- اسلامک فاؤنڈیشن، مقدمۂ مرزائیہ بہاول پور ۱۹۳۵ء، لاہور، ۱۹۸۸ء۔

۸۸- نواب محمد بہاول خاں خامس نے اسی مقصد کے لیے اپنی ریاست کے طول و عرض میں دورے کیے اور دوران سفر عوام کی فوری داد رسی کو اپنا شعار بنایا۔ دیکھیے:

M. Mihar Din, *Diaries of the First and Second Tour of Nawab Bahawal Khan V, 1901*, Bahawalpur.

۸۹- صادق الاخبار گزٹ، ۱۷ نومبر ۱۹۰۴ء، ص ۴۔

۹۰- ایضاً، ۱۴ اگست ۱۹۳۰ء، ص ص ۳-۴۔

91. *The Administration Report of Bahawalpur State 1866-67*, p.14.

92. *The Administration Report of Bahawalpur State 1900-01*, p.47.

۹۳- انتظام جدید ریاست بہاول پور، ۱۹۰۵ء، ص ص ۲۱-۲۲۔

۹۴- مجموعۂ قوانین و ہدایات جوڈیشل گورنمنٹ بہاول پور ۱۹۲۶ء، ص ۱۱۔

۹۵- صبح صادق، ص ۶۳۔

96. *The Administration Report of Bahawalpur State 1900-01*, p.47.

۹۷- صادق الاخبار گزٹ، ۱۲ ستمبر ۱۸۶۷ء، ص ۶۔

98. *The Bahawalpur Government, By-Laws of the Bahawalpur*

Municipal Committee 1874, Bahawalpur.

۹۹- صادق الاخبار گزٹ، ۱۱ جنوری ۱۸۷۵ء، ص ۱۷۔

100. *The Administration Report of Bahawalpur State 1912-13*, p.20.

۱۰۱- بہاولپور کی ٹاؤن پلاننگ کی مکمل تفصیل کے لیے دیکھیے:

M. Fayazuddin, *Report on Town Planning and City Improvement of Bahawalpur State*, Bombay, 1949.

۱۰۲- صادق الاخبار گزٹ، ۱۲ ستمبر ۱۸۶۷ء، ص ۲۔

۱۰۳- ۱۸۳۸ کے اینگلو بہاول پور معاہدہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے: مرزا محمد اشرف گورگانی و مولوی محمد دین، صادق التواریخ، ص ۲۱۷۔

۱۰۴- صبح صادق، ص ۹۱۔

105. *The Administration Report of Bahawalpur State 1945-46*, p.20.

106. *The Bahawalpur Archives. Supplementary Instrument of Accession Regarding the Integration of Bahawalpur State Forces with the Pakistan Army*, dated 24 April 1952.

107. Lee-Warner, *The Native States of India, 1910*, London, p.96.

مصنّفین حضرات رخواتین سے گزارش ہے کہ
وہ اپنے مضامین اور تبصرہ کتب ارسال کرنے کے علاوہ
درج ذیل ای میل ایڈریس

mujallahpjhc@yahoo.com

پر ای میل بھی کر یں تا کہ ادارہ ھذا کو اس کی اشاعت،
وضاحت اور تصحیح کے حوالے سے آسانی میسر آ سکے۔
اس سلسلے میں ادارہ آپ کے تعاون کا شکر گزار ہو گا۔

مدیر مجلّہ